الحمد لائبریری
فیس بک
گروپ۔
کتابیں
پڑھیے
سید حسین احسن
پروین شاکر کی شاعری
ایک تنقیدی جائزہ
ڈاکٹر محمد تنویر

پروین شاکر کی شاعری

ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد تنویر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Parveen Shakir ki Shaiery Ek Tanqeedi Jaaeza
by
Dr. Mohd Tanveer
Room No. 212, Kaveri Hostel
JNU New Delhi - 67, Mb.: 9013843646
Email.:mtanveer.w@gmail.com
Year of 1st Edition 2014
ISBN 978-93-5073-380-6
₹ 200/-

کتاب کا نام : پروین شاکر کی شاعری ایک تنقیدی جائزہ
مصنف : ڈاکٹر محمد تنویر
اشاعت : ۲۰۱۴ء
قیمت : ۲۰۰ روپے
کمپوزنگ : محمد اکرام
مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

والدین

کی

نذر

فہرست

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

پیش لفظ

جب ہم اُردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں شعراء کے ساتھ ساتھ شاعرات کے نام بھی ملتے ہیں جن کو پڑھے بغیر شاعری کی روایت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ قدیم زمانے میں شعر کہنے والی عورتیں بیگمات، شہزادیاں اور بالا خانہ کی خواتین ہوا کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد معاشرے کی عام عورتیں بھی اس صف میں شامل ہو گئیں جنہیں معاشرے نے کافی دیر میں قبول کیا۔ پہلے یہ تاثر تھا کہ خواتین کا شاعری میں محض جذبات کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا مگر خواتین نے جس طرح ادب میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا وہ قابلِ صد آفریں ہے۔ خواتین شاعرات نے ہم عصر کی مسائل کے ساتھ ساتھ ادبی رجحانات و رویے کو بھی پوری طرح اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

خواتین ادب کا شعری حصہ پروین شاکر کی شاعری کے بغیر ادھورا سا معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کی شاعرات میں پروین شاکر کی آواز سب سے منفرد ہے۔ یوں تو ان کے عہد اور موجودہ عہد میں بھی کئی شاعرات کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ پروین شاکر 26 دسمبر 1994 کو ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر انہیں کچھ اور وقت ملا ہوتا تو وہ موجودہ خواتین کے شعری سرمائے میں مزید خوشگوار اضافہ کر سکتی تھیں۔

پروین کی شاعری ہمارے اپنے عہد کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں مختلف طرح کے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شاعری کے میدان میں انہوں نے خصوصاً غزل اور نظم پر زیادہ توجہ دی۔ اس کے علاوہ پابند، آزاد اور نثری نظموں پر بھی طبع آزمائی کی۔ پروین نے اپنی تخلیق میں نئی نئی تشبیہات و استعارات لا کر اردو شاعری کے دامن کو اور وسیع کیا۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے اور دوسری بڑی خوبی ان کی اپنی انفرادیت ہے۔

پروین نے آسان اور عام فہم زبان میں شاعری کی، انہیں کئی زبانوں کا علم تھا۔ ان کی شاعری میں انگریزی، ہندی، عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال اور تراکیبیں ملتی ہیں۔ انہوں نے غزل کی مروجہ زبان سے ہٹ کر اپنا شعری سفر شروع کیا اور غزل کی روایتی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے روایتی زبان و بیان سے انحراف کیا اور اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ انہیں سب خوبیوں کی وجہ سے پروین ہمیشہ یاد کیے جانے کی مستحق ہیں۔

پروین کو بہت کم وقت ملا۔ وہ صرف بیالیس سال تک ہی باحیات رہیں۔ اردو ادب کے شعری سرمایہ میں پروین نے جو اضافہ کیا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ انفرادیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قدیم و جدید شعراء کے درمیان ایک اہم کڑی مانا جا سکتا ہے۔ اس کڑی کے پیوستگی کا تعلق ہند و پاک کے ان اہم شعراء سے ہے جنھوں نے اس دور میں شاعری کو پروان چڑھایا۔ پروین کی انفرادیت اور مختلف خیالات نے شعری ادب کے دامن کو اور وسیع کر دیا جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

پروین کے گل کی خوشبو، عام خوشبو سے الگ اپنی شناخت قائم رکھنے میں ہوتی ہے۔ یہ خوشبو قاری کو ہی نہیں شعری ادب کے اس سرمایہ کو بھی معطر کرتے ہوئے نئی روح بخش دی۔ یہی خوشبو کبھی ہواؤں کے ساتھ محبوب کے آنے کی دستک دیتی ہے تو کبھی امید کے روشن چراغ کو گل کر دیتی ہے۔

پروین کی پوری شاعری عشق و عاشقی کے جذبات سے مختلف کیفیت کا احساس دلاتی ہے۔ زبان سادہ، سلیس اور جملے پیوست ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک پہلو احتجاجی بھی ہے جو مردوں کے استحصال کے خلاف ہوتا ہے۔ عورتوں کی معصومیت اور ان کی پاک محبتوں کا ناجائز

فائدہ اٹھانے اور پھر اس کی پرواہ نہ کرنے کے خلاف ہے۔ پروین نے ہی نہیں ان کی ہمعصر شاعرات نے بھی اس موضوع پر آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جس تخیل پردازی کا مظاہرہ کیا ہے وہ دوسروں کے یہاں کم ہی ملتا ہے۔ پروین نے غزل، نظم اور مختصر نثر بھی لکھی ہے۔

پروین شاکر کے پانچ شعری مجموعے 'خوشبو'، 'صد برگ'، 'خود کلامی'، 'انکار'، 'کف آئینہ' ہیں بعد میں 'ماہِ تمام' کے نام سے ان کا کلیات شائع ہوا۔ پروین نے اپنے محبوب کو جس جس انداز میں پیار کیا۔ اسے منانے کی کوشش کی اور امید و یاس کی جو نوعیت پیش کی وہ اردو شاعری میں قابل تعریف ہے۔ پروین نے اپنی شاعری میں اردو، ہندی، انگریزی، عربی اور فارسی کے الفاظ سے بھی اپنی کیفیت کو بیان کیا ہے۔

پروین شاکر ایک ساتھ عورت بھی ہیں، بیوی بھی ہیں اور ماں بھی۔ ان تینوں رویوں میں رہ کر انھوں نے سبھی کا حق ادا کیا ہے۔ جہاں عورت ہیں، مردوں کے استحصال کے خلاف احتجاج کرتی ہیں، جہاں بیوی ہیں شوہر سے محبت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جہاں ماں ہیں وہاں بچوں سے پیار کرنے، ہنسنے مسکرانے اور طفلانہ انداز میں بات کرنے کا احساس دلاتی ہیں۔ ان مختلف رویوں میں پروین ہر جگہ فٹ نظر آتیں جس کی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اندر احتجاج کے ساتھ ساتھ ممتا کا پیار بھی ہے۔ وہ اپنی انھی انفرادیت سے شعری دنیا میں اہمیت رکھتی ہیں۔

اردو شاعری میں پروین شاکر کو جو مقام ملا حقیقت میں وہ اس کی مستحق تھیں۔ شعری ادب میں پروین کی کمی کا احساس ہمیشہ رہے گا۔ ان کا اچانک روپوش ہو جانا ادب کی دنیا میں ایک بڑا جھٹکا ہے۔ پروین کو اردو شاعری کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اخیر میں ان حضرات کو کیسے بھول سکتا ہوں جنھوں نے میرے اس تخلیقی کام میں ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ میرے والدین اور استاد پروفیسر خواجہ اکرام الدین کا شکریہ ادا کرنا تو ایک رسمی بات ہوگی۔ بعض اساتذہ جنھوں نے قدم قدم پر میری پزیرائی کی اور خیر خواہی کے لیے دعائیں کرتے رہے ہیں، میں ان لوگوں کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔

میرے اس تحقیقی و تحریری کاموں میں میرے جن دوستوں نے ہمت دلائی، ان میں ڈاکٹر نسیم احمد، ڈاکٹر جمشید احمد ڈاکٹر مجاہد اسلام، ڈاکٹر شارد جمال انصاری، ڈاکٹر نورالنساء، فیضان احمد، امام الدین انصاری، ڈاکٹر انوراگ بگیریا، ڈاکٹر راجیش شرما، ڈاکٹر جے دیپ رجک، یوگیس چورسیا اور ویراج کافلے وغیرہ۔ ان سبھی کا میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر تنویر
روم نمبر 212، کاویری ہاسٹل
جے این یو، نئی دہلی 67

پروین شاکر: عہد اور شخصیت

قدیم زمانے سے ہی شعری صنف کو اہمیت حاصل رہی ہے اور موجودہ دور میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتوں نے بھی ادب کی تخلیق و تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناول اور افسانے میں بھی بعض خواتین کے نام عزت و احترام کے ساتھ لیے جاتے ہیں جن میں جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو قدیم شاعرات کی بھی اچھی خاصی تعداد ہمارے سامنے ہے لیکن ان میں چند شاعرات ایسی ہیں جن کے ذکر کے بغیر آگے بڑھنا ان کی حق تلفی سمجھی جائے گی۔ ان شاعرات میں محترمہ احمدی بیگم، نواب صدر محل، نواب ملکہ واجد علی شاہ، سلطان بیگم شیریں اور شاہجہاں بیگم وغیرہ ہیں۔ ان میں شاہجہاں بیگم شیریں صاحبِ دیوان شاعرہ گزری ہیں۔

جدید شاعرات میں ادا جعفری بدایونی، یاسمین حمید، شبنم شکیل، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان جدید شاعرات میں پروین شاکر ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ ان کا منفرد اندازِ بیان، لب و لہجہ اور ان کے فکری رجحانات انہیں اپنے ہم عصر شاعرات سے مختلف کرتے ہیں۔

پروین کا تعلق عہدِ حاضر سے ہے۔ ان کے یہاں تجربات بہت گوناگوں ہیں اور اظہار میں بھی بے باکی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے جو اردو کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں نہایت منفرد اور خوبصورت اضافہ ہے۔

ڈاکٹر روبینہ شبنم پروین شاکر کی پیدائش سے متعلق لکھتی ہیں کہ:

''پروین شاکر ۲۴ رنومبر ۱۹۵۲ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام سید شاکر حسین، تخلص ثاقب تھا۔ وہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کے شیخوپورہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔''

جب کہ قاضی مشتاق احمد اپنی کتاب ''اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک'' میں لکھتے ہیں کہ:

''پروین شاکر کا آبائی وطن چندن پٹی تحصیل لہریا سرائے ضلع دربھنگہ ہے۔ ان کے والد سید ثاقب حسین شاکر بھی شاعر تھے۔ والدین تقسیم ہند کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ ۱۹۵۲ء کو پروین شاکر کی پیدائش ہوئی۔''

('اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک' قاضی مشتاق احمد، ص: ۲۴۱-۲۴۲)

پروین کا شمار بچپن سے ذہین طالبہ میں ہوتا تھا۔ وہ اپنی کلاس میں اعلیٰ مقام حاصل کرتی تھیں۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان رضویہ گرلس ہائی اسکول کراچی سے پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں سرسید گرلس کالج سے انگلش لٹریچر سے بی۔ اے آنرس کیا اور ۱۹۷۲ء میں جامعہ کراچی سے ایم۔ اے (انگلش) اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ لسانیات سے بھی انہوں نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۳ء میں انہوں نے ایم۔ بی۔ اے (ماسٹرز اِن بزنس ایڈمنسٹریشن) کی ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی سے لی اور اسی سال مینجمنٹ انفارمیشن کا کورس بھی کیا۔ انہوں نے ابتدا میں درس و تدریس کا کام انجام دیا پھر سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے محکمہ کسٹمز سے وابستہ ہو گئیں۔ ۱۹۸۲ء میں سیکنڈ سکریٹری سی۔ بی۔ آر (اسلام آباد) متعین ہوئیں اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمنسٹر اور پھر ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔

پروین جس گھر میں پیدا ہوئیں وہ شاعرانہ ماحول سے پُر تھا۔ انہیں شاعری کا ذوق اپنے والد سے ملا تھا کیونکہ ان کے والد خود ایک باکمال شاعر تھے۔ کالج کے دنوں سے ہی پروین شاعری کرنے لگی تھیں۔ اس وقت انہوں نے اپنا تخلص بینا رکھا تھا۔ اوائل میں شاعری کی اصلاح اپنے نانا سے کروایا کرتی تھیں اور بعد میں عرفانہ عزیز سے مشورہ سخن کرنے لگیں۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی نے پروین کے ادبی ذوق کو اور بلندی پر پہنچایا۔ اس طرح ان

کی شاعری میں اور پختگی آ گئی۔ ان کی پہلی نظم روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہوئی۔ آفتاب احمد ان کی شاعری کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''پروین شاکر نے اپنی شاعری کا آغاز خوشبو کے وطن، یعنی خوش رنگ پھولوں، خوشنما رنگوں اور خوشنوا طائروں کی وادی سے کیا' مگر جلد ہی زندگی نے ان کی راہوں میں کانٹوں کے جال بچھا دیئے۔ کیونکہ وہ طبعاً گلشن پرست واقع ہوئی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے پھول ہی نہیں چنے، کانٹے بھی سمیٹ لیے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں، تخلیق کی دیوی ان کے یہاں بہ چہرہ تبسم بہ چشم تر آئی ہے۔''
>
> (مضمون پروین شاکر، آفتاب احمد، ماہ نامہ 'شاعر' شمارہ:۱۲، صفحہ:۱۲)

پروین کو شاعری میں بیشمار اعزازات ملے جو ان کی شاعری کی پختگی اور شاعری کے فنِ کمال پر عبور کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۴ء تک کے سفر میں جذبے، احساس و شعور کے بڑے فاصلے طے کیے تھے اور اپنے تخلیقی سفر کی روداد کو ادبی دنیا کے خزانے میں پانچ شعری مجموعوں کی شکل میں جمع کیا۔ سب سے پہلا مجموعہ ''خوشبو'' (دسمبر ۱۹۷۷ء) دوسرا ''صد برگ'' (فروری ۱۹۸۰ء) تیسرا ''خود کلامی'' (اگست ۱۹۸۵ء)، چوتھا ''انکار'' (مئی ۱۹۹۰ء)، پانچواں اور آخری مجموعہ ''کفِ آئینہ'' جو وفات کے بعد (۱۹۹۵ء) میں شائع ہوا۔ پروین کے اس شاہکار اضافے نے ادبی دنیا میں خود اپنا لوہا منوایا۔ ان کا پہلا مجموعہ ''خوشبو'' کو عوام الناس نے تو پسند کیا ہی، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری اور احمد فراز جیسے بڑے شاعروں نے بھی اُسے داد سے نوازا۔ دوسری طرف نثری کاوش ''آئینے کے اُس پار'' ہے۔ ۲۰۰۰ء میں ان کا کلیات جو ''ماہِ تمام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

پروین نے کم عمری میں ہی اپنی فنی صلاحیت اور استعداد کے بل پر پانچ بڑے ادبی انعامات و اعزازات حاصل کیے۔ انہیں ۱۹۷۸ء میں مجموعہ ''خوشبو'' کی کامیابی پر آدم جی ایوارڈ ملا جو پاکستان میں ایک قومی سطح کا اعزاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں انہیں ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ برائے ادب دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں یو ایس آئی ایس (USIS) ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ اس

کے علاوہ فیض احمد فیض انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا جو ان کی شاعرانہ رتبے کی شایانِ شان ہے۔اس کے علاوہ پروین کو"پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا جو حکومت پاکستان کا سب سے بڑا انعام تسلیم کیا جاتا ہے۔

پروین کی شاعری میں دلی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے یعنی جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ اسی کا نقش وہ اپنی شاعری میں ڈھالتی ہیں۔انہیں شعر گوئی کا ملکہ اور نسوانی جذبات کے اظہار پر کمال حاصل تھا۔وہ بے حد مہذب شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ان کا اندازِ گفتگو بہت سہل ہے۔وہ اپنی گفتگو میں مشکل اور ثقیل الفاظ سے گریز کرتی تھیں اور اپنی نرم مزاجی کے باعث دھیمے لہجے میں باتیں کرتی تھیں۔ان کا کہنا تھا کہ"میں جو ہوں وہی ہوں ویسے ہی سامنے رہنا چاہتی ہوں۔"

پروین کی شخصیت کے سلسلے میں عبدالاحد ساز لکھتے ہیں کہ:

"پروین شاکر بلاشبہ اپنی شخصیت اور فن کے گہرے نقوش چھوڑنے والی ایک ایسی خاتون تھیں جسے قدرت نے حسن و جمال، علم و ہنر اور ثروت و منزلت سے ایک ساتھ نواز رکھا تھا۔اس نے شاعری اور فن سے ٹوٹ کر محبت کی اور خود بھی اپنے عہد کی شاعری کی آنکھوں کا تارا بن کر رہی۔"

(سہ ماہی'اسباق'، فروری ۱۹۹۵ء)

ممتاز مفتی اپنے مضمون "شہزادی... پروین شاکر" میں رقمطراز ہیں کہ:

"ان کی شخصیت کی تین پرت ہیں۔"

پہلا پرت دیکھو تو لطافت ہے، لے ہے، معصومیت ہے اور حیا کے جال ہی جال۔

دوسرا پرت دیکھو تو منظر ہی بدل جاتا ہے۔"لولی" وینس ڈی مائیلو Spinex بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ذہنی پختگی، سردانہ جرأت اور Crude realism۔جبھی سیانے سمجھدار پہلے پرت پر ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ذاتی تحفظ یا ڈر کے مارے فاصلے قائم رکھتے ہیں۔

تیسرا پرت پیش منظر نہیں پس منظر ہے۔ دکھ کی ایک بے نام بھیک جو ساری
شخصیت میں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔"

پروین کی پُرنم شخصیت کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے دکھ کے پانی میں گھرا ہوا ایک سرسبز جزیرہ ہو، لیکن ان کی آنکھوں میں ایک ایسی نگاہ ہے جو چلتی آندھی کو باندھ سکتی ہے، دریا کا رُخ موڑ سکتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس کی پُرنم شخصیت جاذب کیفیت کے علاوہ ایک ہتھیار بھی ہے جسے انہوں نے اپنے گھر سے حاصل کیا ہے۔ پروین اثنا عشری گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بچپن سے ہی شعر کے آہنگ کو جز و سماعت بنایا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں انیس کے اشعار غیر شعوری طور پر ان کی لفظیات کا حصہ بن گئے ہیں جس کی وجہ سے سوچنے و بولنے میں اکثر سادہ لفظ و آہنگ کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کی شاعری میں سادگی، شگفتگی، سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔

پروین ایک حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ وہ اپنی زندگی کو ایک اچھی اور خوش حال زندگی کی طرح گزارنا چاہتی تھیں لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ دیکھے ہوئے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔ انہی محرومیوں کی وجہ سے ان کی ذات میں مایوسی اور اداسی کا عکس نظر آتا ہے۔ پروین خود اپنی ذات سے متعلق لکھتی ہیں:

"مجھے اداس رہنے کا کوئی شوق نہیں۔ اگر زندگی نے آپ کے ساتھ کوئی
بہت اچھا سلوک نہیں کیا تو آپ نسبتاً اپنے ساتھ تو دیانت سے رہیں گے۔
میں اداس تو نہیں لیکن سنجیدہ ضرور ہوں۔ ایسی نہیں ہوں کہ میرے اندر
مزاح کا حسن نہ ہو۔ میں زندگی سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ حتیٰ کہ میرے
دفتر میں بہت مختلف قسم کا کام ہے۔ وہاں بھی اپنے لیے ریلیف ڈھونڈ لیتی
ہوں۔ "Enjoy life"

('خوشبو کی شاعری' پروین شاکر، ص: ۴۷)

اپنی ہم عصر شاعرات کی طرح پروین بھی مشاعروں میں جاتیں تھیں اور غزلیں پڑھتی تھیں مگر انہوں نے کبھی ترنم سے شاعری نہیں پڑھیں کیونکہ ان کی صورت جتنی خوبصورت تھی آواز اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ کبھی کبھی انہوں نے ترنم سے پڑھنے کی کوشش کی لیکن سامعین کو وہ

لطف نہیں ملا جوان کے اشعار پڑھنے کے انداز میں ملتا تھا۔ پروین شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مقرر بھی تھیں مگر انہوں نے ان دو راہوں میں سے شاعری کی راہ کو اختیار کیا اور پھر زندگی بھر اسی راہ پر گامزن رہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ:

"تقریر انسان کو ہجوم کی طرف لے جاتی ہے اور شاعری تنہائی کی طرف۔"

اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پروین نے کیوں شعری راہ کو اختیار کیا چونکہ وہ تنہائی کو اپنا ہم سفر مانتی تھیں اور گوشہ نشینی کو زندگی کا جز۔ تنہائی کو وہ ہمیشہ زندگی کا سہارا مانتیں جس کے حوالے سے ہر اک انسان دوچار ہوتا ہے۔ مگر تنہائی میں خوش رہنا حوصلہ مندوں کا ہی کام ہوتا ہے۔

جہاں تک خوشی اور دل لگی کی بات ہے تو وہ زندگی کو مثال بنانا چاہتی ہیں تا کہ ہمیشہ دوسروں کے ذہن میں رقص کرتی رہیں اور دل لگی کے بارے میں کہتی ہیں کہ انسان کو جب یہ محسوس ہو کہ وہ ادھورا ہے، نامکمل ہے اسے کسی اچھے دوست کی ضرورت ہے یا پھر یہ محسوس ہو کہ وہ کسی سے اپنی راز و نیاز کی باتیں سنا ڈالے تو ایسی کیفیت کو دل لگی اور محبت کہتے ہیں۔

پروین کے عہد میں ذات کی تنہائی کا بہت بڑا مسئلہ تھا یہ مسئلہ صرف انہیں کا نہیں بلکہ پوری بیسویں صدی کا مسئلہ تھا۔ مغرب و مشرق میں اس تنہائی نے دردِ مشترک کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ مگر ان دونوں حصوں میں رہنے والوں کے احساس تنہائی کے تناظر اور ان کے مضمرات یکسر مختلف ہیں۔ مغرب میں دو بڑی عالمی جنگیں اور پھر جوہری اسلحہ کی انجام ناشناس تیاریوں اور ہمہ گیر موت کے خوفناک امکانات نے زندگی کو بے مفہوم اور انسان کو تنہا بنا دیا ہے مگر ادھر مشرق میں ہماری دقیانوسی معیشت اور بوسیدہ معاشرت اور نظریاتی تنگ نظری اور مذہبی تعصبات کے سلسلے میں مبالغہ پسندی اور مغرب کی سائنس اور مادی ترقی کے سامنے احساس کمتری نے ہم پر اپنی اپنی تنہائی کے خول چڑھا رکھے ہیں۔ اس سلسلے میں پروین نے اپنے مجموعہ "خود کلامی" کی ایک نظم "ہشت پایہ تنہائی" میں اپنے تخلیقی ضمیر کے تقاضوں سے بے چین ہو کر کہتی ہیں۔

وہی تنہائی، وہ دھوپ وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہوا، راہ گزر میں رہنا

سوچ کے پرندوں کو اک پناہ دیتا ہے
دھوپ کی حکومت میں ذہن کا شجر ہونا

آلام حیات لوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں

بلیغ استعاروں اور بامعنی علامتوں سے سجی سنوری اس شاعری کو اگر محمد علی صدیقی جیسے نقاد نے ''رجحان ساز شاعری'' کہا ہے تو بالکل درست کہا ہے۔

پروین نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ وہ اردو شاعری کے لیے ایک لسانی شائستگی کی علامت ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل کا ظاہری رنگ قائم رکھتے ہوئے اس کی ہیئتِ ترکیبی کو یکسر بدل ڈالا۔ غزل کی تاریخ بتاتی ہے کہ غزل ''سخن بازنان گفتن''، ''حکایات بایار گفتن'' ان معنوں میں غزل کی تاریخ بدل گئی۔ پروین کے معاملہ میں غزل گوئی کی روایت اپنی ایک نئی راہ طے کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی حالات کی شاکی نہیں۔ وہ صرف ایک بات زیرِ لب کہتی ہیں۔ چونکہ بات بہت اہم اور معنی خیز ہوتی ہے اس لیے ایک گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

لوٹا ہے وہ پچھلے موسموں کو
مجھ میں کسی رنگ کی کمی تھی

پروین نغمہ گو شعری روایت کی وہ شہزادی ہیں جس نے نہ صرف پوری اردو شاعری کو اپنے تجربات سے ایک نئی تاریخ دی بلکہ تجربات، خیالات کے نت نئے افق بھی روشن کیے۔ شاعرات نے قدیم و جدید کی جس شعری روایت کی نمائندگی کی اسے اوجِ ثریا تک لے جانے

کا سہرا پروین کے سر جاتا ہے۔ پروین کا شعری سفر ''خوشبو'' سے شروع ہوتا ہے۔ اردو شاعری کو لفظ ''خوشبو'' کے پورے اعتماد کے ساتھ پروین نے پہلی بار متعارف کرایا۔ لفظ ''خوشبو'' کا بار بار ذکر علامہ اقبال کے لفظ ''خودی'' کی یاد دلاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں لفظ ''خودی'' کا تصور ایک نئی معنویت لیے ہوئے ہے۔ پروین کے یہاں لفظ ''خوشبو'' ایک نئے رنگ ایک نئی معنویت کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے۔

O

پروین شاکر کی ہم عصر شاعرات

ادا جعفری

جب ہم شاعرات کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یقیناً ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دبیز پردوں اور بلند فصیلوں کے اندر پنپنے والی شاعری بھی ادب کی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ بعض شاعرات کے اشعار تو اساتذہ سخن کے زبان زد اشعار سے آنکھیں ملانے کی سکت رکھتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ اگر وہ سماجی پابندیوں میں جکڑی نہ ہوتیں اور اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کر سکتیں تو بیشتر شاعرات کے لیے صفِ اساتذہ میں جگہ پانے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔

خواتین میں سب سے پہلے جنھوں نے اردو شعر گوئی کا ثبوت دیا ان میں اورنگ زیب کی سب سے بڑی لڑکی زیب النساء مخفی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے نام چند اشعار منسوب کیے جاتے ہیں۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست کو جدا نہ کرے

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

اگر ہماری لاش پہ کیا پار کرچلے
خوابِ عدم سے فتنے کو بیدار کرچلے
(زیب النسا مخفی)

دورِ جدید میں پروین شاکر کی ہم عصر شاعرات کی فہرست میں مندرجہ ذیل شاعرات کے نام لیے جاسکتے ہیں جن میں ادا جعفری، سارہ شگفتہ، زہرہ نگاہ، بسمل صابری، مسعود حیات، یاسمین حمید، نسرین انجم، تنویر انجم، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ظہیر النساء نگار، شبنم شکیل، ساجدہ زیدی، زاہدہ زادی، عائشہ جیت، ناظمہ طالب، نیر جہاں، رفیعہ شبنم عابدی، فاطمہ شفیق شعری، زرینہ ثانی، ممتاز مرزا، روحی کنجاہی، عزیز بانو دراب وفا، جمیلہ بانو، سیدہ اختر، صدف جعفری، شاہجہاں بانو یاد، پروین کیف، ممتاز صنم، عارفہ کمال، نعیمہ اختر، بشریٰ زیدی، سیدہ عنوان چشتی، ضوفشاں انجم، شاہدہ حسن، آمنہ ابوالحسن، انجمن آرا شبنم، افسانہ نگار، ام ہانی، نسرین نقاش اور نجمہ سلطانہ وغیرہ۔ ان شاعرات میں سے میں نے جنھیں مخصوص سمجھ کر منتخب کیا ہے ان میں بالترتیب ادا جعفری، یاسمین حمید، شبنم شکیل، زہرہ نگاہ، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض ہیں۔

بیشک عصر حاضر کی شاعرات میں پہلا نام ادا بدایونی کا آتا ہے۔ وہ پہلے اپنے نام کے اخیر میں بدایونی لگاتی تھیں کیونکہ ان کے آبا و اجداد بدایوں (ہندوستان) کے رہنے والے تھے مگر پاکستان منتقل ہونے کے بعد ادا جعفری لکھنا شروع کر دیں۔

ادا جعفری نے معاصرین کے ساتھ ساتھ متاخرین کے لیے خاصی فضا ہموار کیں۔ انہوں نے روایت اور جدید ادب دونوں کو ملحوظ رکھا۔ ان کے کلام میں موضوعات اور ہیئت کے لحاظ سے جدت تو ضرور ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے روایت کی پاسداری بھی ملتی ہے اور وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتی ہیں۔ ان کی پہلی نظم ''احساس اولیں'' ہے۔

ادا جعفری چونکہ ایک عورت ہیں اس وجہ سے انہیں عورت کی احساس محرومی سے شکایت ہے اور ابتدائے آفرینش سے اس کمی کے ازالہ کی تلاش میں ''ساز ڈھونڈھتی رہی'' کی علامت بن کر ابھری ہیں۔ بے جا کوششوں کے باوجود اس ساز سے محروم رہی ہیں۔ اب انہیں جس نئے نظام کی بشارتیں دی جارہی ہیں، جن خوش رنگ ماحول کی خبریں سنائی جارہی ہیں کیا وہ معاشرہ آزادیٔ نسواں اور احساس محرومی کے ساتھ وجود نسواں کا ترجمان ہو پائے گا؟ اس کے تئیں بھی انہیں شبہ ہے۔

زمیں پہ شعلہ باریاں، فلک پہ گڑگڑاہٹیں
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظام کی آہٹیں

بہار بیت ہی چکی، خزاں بھی بیت جائے گی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی

وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظامِ نو بھی مجھے ساز دے سکے گا یا نہیں

وہ غم ذات سے نکل کر غم کائنات سے جڑ رہی ہیں اور ان کا سفر ''میں ساز ڈھونڈھتی رہی'' سے نکل کر ''شہر درد'' میں داخل ہوتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں کہ:

> ''ادا بدایونی جو ساز ڈھونڈھتی رہی تھیں غالباً اب ادا جعفری کو شہر درد ہاتھ آگیا ہے۔ ادا کے لہجے میں اب ایسا ایسا تیقن اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آجانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ ''شہر درد'' نہایت موثر باسلیقہ اور باوقار کلام کا مجموعہ ہے۔'' (ادا جعفری، سازِ سخن، انتخاب کلام، تعارف حمایت علی شاعر، ص:۱۲)

ادا جعفری کی ایک نظم ''ماں'' ہے اس میں انہوں نے جن احساس و جذبات کو پرو دیا ہے۔ ایک مکمل ماں کی ممتا ہے۔ یہیں پہ ماں کو علامت کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے جس کا دوسرا پہلو مادر وطن بھی ہے۔ ان کی دوسری نظم ''میلاد بہار'' ہے۔ اس نظم میں بھی ماں کا اُمڈتا ہوا جذبہ اور محبت اپنے شباب پر ہے۔ نظموں کا سلسلہ جوں جوں ارتقاء پذیر ہوتا ہے فنی بالیدگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ''مسجد اقصیٰ'' میں عظمت انسانی کا اعتراف ہے اور ''ساز سخن بہانہ ہے'' میں عورت کی بے بسی اور بے چارگی کا سوال ہے۔ ایک صرف آرزو جس کی تکمیل ممکن نہ ہو سکی ''آشوب آگہی'' اور ''سانجھ سویرے'' میں ایسے ہی حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ ادا جعفری کی شاعری میں بتدریج ایک کمسن دوشیزہ سے مکمل عورت بننے کا شعری سفر ہے۔ ادا کو پاکستان کی امرتا پریتم کہا جاتا ہے۔

فکر اور ہیئت کے نقطہ نظر سے ادا جعفری نے روایتی قدروں کو توڑا مگر لب و لہجہ کے اعتبار سے کوئی خاص تبدیلی نہیں کی۔ انہوں نے نظموں کی سی کیفیت غزلوں میں بھی پرونے کی کوشش کی اور لہجہ کو باغیانہ بنایا۔

محبت سے متعلق ادا جعفری کا برتاؤ نہایت پیارا ہے۔ تمام ستم سہنے کے باوجود ان کے یہاں عشق و محبت کا جذبہ اتنا بلند ہے کہ محبوب کے بغیر جینے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ جیسے یہ شعر جوان کے اس جذبہ کی تقلید کرتا ہے۔

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

ادا جعفری کے یہاں جو نسائی جذبہ ملتا ہے وہ ان کی شاعری میں صاف اور کھل کر دیکھا جاسکتا ہے۔ لب و لہجے میں تصنع کو دخل نہیں۔ انہوں نے بڑے ہی اچھے طریقے سے اپنی شاعری میں نسائی جذبوں کو ابھارا ہے اور اپنی بات منوانے کی کوشش کی ہے۔ قدیم و جدید کے امتزاج نے اشعار میں حسن اور پختگی پیدا کردی ہے۔ مگر تجربات میں تیکھا پن ہے۔ لفظیات کا انتخاب گرچہ مضمون کے وصف میں اضافہ کرتا ہے لیکن کہیں کہیں فارسی آمیز تراکیب مثلاً حریف نگہ چشم، کاسۂ دریوزہ، حرمت سجدہ، مسیح عرصۂ جاں، شگفتہ حیرانیاں، موجۂ ریگ گزراں، غبار سرمنزل وغیرہ پیغام رسائی میں پیچیدگی کے ساتھ ساتھ مشکلات پیش کرتے ہیں۔

یاسمین حمید

آزادی اور تقسیم وطن کے بعد دونوں ملکوں (ہندوستان اور پاکستان) میں جدید ادب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی میں خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے خیالات و رجحانات کو نظموں اور غزلوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کیں۔ ان خواتین میں یاسمین حمید ایک اہم نام ہے۔ ان کا شعری سفر مجموعہ ''پس آئینہ'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ کلام غزلوں پر مشتمل ہے جس میں بنیادی طور پر عورتوں کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ جدید معاشرے کی مانگ نے خواتین کو گھر اور باہر کی دنیا کے ان سبھی مرحلوں سے گزر جانے پر مجبور کردیا جس میں اب تک ان کو قید رکھا گیا تھا۔ آج عورتیں محض بیوی، بیٹی، بہن، بہو یا ماں نہیں بلکہ وہ مردوں کے مدِ مقابل کسی بھی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے کھڑی ہیں۔ مگر بنیادی طور پر وہ ایک محبت اور جانثاری کے فطری جذبوں سے پوری عورت بھی ہے۔ اس جدید دور میں جہانِ نو جس تہذیب کو اپنی زندگی کا حامل سمجھتا ہے اس سے انہیں ناراضگی بھی ہے۔ مغربی کلچر کے اثرات نے

خلوص اور پیار محبت کے جذبوں کو ختم کر دیا ہے ۔ یاسمین نے اپنی ناراضی کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں:

بارش کے بعد مہرباں بادل گزر گیا
دھرتی بہت اداس ہے زخم وصال پر

یاسمین کے یہاں میؔر کے لہجے اور لَے میں زیادہ مماثلت ہے۔ خواہ وہ شعوری ہوں یا لاشعوری ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے بدلتے ہوئے حالات کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی نوعیت دوسری ہے۔ چونکہ یاسمین اِس جدید دور کی شاعرہ ہیں اس لیے اس کے علائم کی معنوی حیثیت میؔر سے مختلف ہو جاتی ہے اور یہ ان کی ایک الگ انفرادیت بھی ہے۔

جاؤ تم عادی ہے دل ویرانیوں کا
اس میں پہلے بھی کوئی رہتا نہیں تھا

کوئی پُر رونق شہر تو تھا نہیں
دل کھنڈر ہی تھا تباہی سہہ گیا

نیا مکان بنانے کے واسطے کوئی
بنی بنائی عمارت کو توڑنا چاہا

اجتماعیت کو میؔر نے دھیان میں رکھا مگر یاسمین کی شاعری میں یہ علائم ان کی اپنی زندگی کا اظہار بن کر آتے ہیں جس میں محبوب کی بے وفائی، عورت کے احساس محرومی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہم عورت کو سراپا دیکھیں تو اس میں ایک سچائی نظر آتی ہے۔ اسی لیے عورت کا دوسرا اور خوبصورت نام وفاداری بھی ہے جو اس کی فطرت میں شامل ہے۔ ان کے اندر جذبہ ایثار و قربانی اسی درجہ بلند ہے کہ وہ اپنے یار، اپنے عاشق کی ہر خواہش پر اپنی جان تک قربان کر دیتی ہے اور محبت میں اس قدر مدہوش ہو جاتی ہے کہ اس کو اپنا وجود بھی یاد نہیں۔ وہ اپنے محبوب کے اندر ہر وہ چیز کی جستجو کرتی ہے جو وہ چاہتی ہے اور یہی جستجو اپنے محبوب کو پانے کے لیے بے قرار کر دیتی ہے۔

ہمارے نام کے حق دار کس طرح ٹھہرے
وہ زندگی جو مسلسل ترے اثر میں رہی

وہ جس کو مرا بچپن سوچتا اور چاہتا ہے
کسی کی ذات میں وہ رنگ سارے ڈھونڈتی ہوں

میرا بھی ایک نام ہے میرا بھی اک مقام ہے
یہ بھول ہی گئی تھی مگر اس کی چاہ میں

یاسمین کو اس بات کا دھیان ہے کہ وہ ایک ایسی جنس ہیں جس کے لیے مذہب اور پھر معاشرے نے کچھ محدود دائرے بنا رکھے ہیں جس سے باہر آنا معاشرہ میں ذلیل ہونا ہے۔

قدرت نے ہمیں ایک حسین تحفہ بخشا ہے۔ یہ تحفہ ہے ازدواجی زندگی۔ اس زندگی میں شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اس زندگی کو پانے کے لیے زمانے نے شادی کی ایک رسم بنا دی ہے۔ یہ نظریہ عام ہے کہ لڑکی کو صرف تسکین نفس، دو وقت کی روٹی اور ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے علاوہ بھی کچھ ایسی چیزیں ہیں جن سے وہ محروم رہتی ہے وہ اس کی نسائیت ہے۔ عورت چاہے خود تکلیف میں رہے مگر وہ اپنے محبوب کو خوش دیکھنے کے لیے مسکرا کر اس کی خوشی میں شامل ہو جاتی ہے۔ عمر بھر وہ محبوب کی ترقی اور خوشی کے لیے اپنے کو قربان کرتی رہتی ہے۔

میں ساتھ دیتی رہی کوئی فیض پاتا رہا
مری حیات کسی دوسرے کا بخت ہوئی

آپ اندر کے موسم کو سمجھیں گے کیا
چہرہ دیکھیں گے اور بیج بو جائیں گے

سر پہ چھت تو پڑ گئی ہے یہ مگر سوچا نہیں
دل کی بے سمتی کو بھی کوئی ٹھکانہ چاہیے

یاسمین مرد کی زیادتی اور بے رحمی کو برداشت نہیں کر پاتیں اور جواب دینے کے لیے خاموش نہیں بیٹھتیں بلکہ یوں طنزیہ وار کرتی ہیں۔

بہت ہی تیز ہے خنجر کسی کے لہجے کا
میرے سلے ہوئے ہونٹوں کو کھولنا چاہے

یاسمین کے یہاں زبان و بیان کے اعتبار سے جدت ہے اور نفسِ مضمون میں بھی جدید رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ فکر و فن کے لحاظ سے یاسمین غزل کو برتنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے نظموں کے موضوعات کو بھی غزل میں پرویا ہے جس سے ان کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ پیغام رسائی میں کسی رُکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ انہیں سب خوبیوں کو دیکھتے ہوئے ہم یاسمین کی شاعری کو جدید دور کی عورت کی مکمل داستان کہہ سکتے ہیں۔

شبنم شکیل

شبنم شکیل اپنی ہم عصر شاعرات میں ایک کامیاب شاعرہ ہیں۔ یہ ایک مختلف لب ولہجہ اور منفرد خیالات کی مالک ہیں۔ شبنم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خالص روایتی غزل کی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے ''شب زاد'' سے اپنے شعری کارواں کا آغاز کیا۔ ان کی غزلوں نے ذات اور کائنات کے چھوٹے چھوٹے تمام واردات کو اپنے اندر جذب کیا۔ ان کے یہاں اپنے گرد و پیش اور روحِ عصر کی آگہی ہے جس کو شبنم نے غزل کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ انہیں معاملاتِ عشق، جو ایک فطری عمل ہے، کے ساتھ ان کا برتاوَ قابلِ ستائش ہے۔ شبنم جو کہ ایک عورت ہے اور عورت ان کی غزلوں کی جان ہے۔ جابجا نسائی جذبے نسائی لہجے میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے روایتی غزل کی حمایت کے باوجود روش عام سے الگ مقام بنایا ہے۔ منیر نیازی رقمطراز ہیں:

> ''شبنم شکیل کی روش عام روش سے ہٹی ہوئی شاعری ہے ''برگ وگل'' میں یہ احساس ہوا کی طرح چلتا ہے۔ مگر یہ احساس اس کے اشعار کو زیادہ افسردہ، بہت پُر ملال نہیں کرتا۔ رائیگانی کا غم اپنی حدوں میں رہتا ہے۔ اس مرکزِ خیال سے اور بہت سے تصورات اور مضامین جُڑے ہوئے ایک

نئے مسکن حیات کا سا منظر بناتے ہیں۔ اس کی شاعری کا خمیر دردمندی،
احساس حزن و جمال اور عمر کی رائیگانی کے خیال سے اٹھتا ہے۔ گہری فکری
مضافات کا بیان، جو اس کی غزلوں میں ہے، کتابی اور مروجہ تنقیدی رویوں
کے ردِ عمل سے آزاد اور شاعرانہ ہے۔"

(شبنم شکیل 'شب زاد' مجموعہ کلام، ص:۱)

شبنم کے یہاں عشق و محبت کے عنصر زیادہ ہیں۔ معاملات عشق میں اس خیال کی قدرت پر حیرانی ہوتی ہے۔ محبت میں شبنم اس قدر ڈوبی ہوئی ہیں کہ جسے کبھی دل نے یا آنکھوں نے نہیں پایا، جس نے کبھی پیار سے نہ دیکھا نہ بات کی پھر بھی اس کے کھو جانے کی فکر اور غم دل کو ستا رہا ہے۔ عشق کا یہ جذبہ اپنی بلندیوں کو چھوتا ہے اور اس بلندی سے جسم نہیں بلکہ روح سیراب ہوتی ہے اور اپنے محبوب کی یاد سے غافل ہونا یا ایک لمحہ کے لیے بے خبر ہونا شبنم کے لیے ایک سنگین جرم سے کم نہیں

جس دن تیری یاد نہ آئی یوں محسوس ہوا
جیسے بھول گئی ہوں میں اک بہت ضروری کام

اس کو کھونے کا رنج ہے دل کو
جس کو ہرگز کبھی نہ پایا تھا

شبنم ایک کامیاب شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک اچھی فنکار بھی ہیں جس کے اندر حساس دل ہے۔ فنکار سے زیادہ حساس کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ انہیں اس کا شدت سے احساس ہے کہ صنف نازک تو ہر حال میں کسی نہ کسی طرح ظلم و استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ اپنے وجود اور حق کے واسطے آواز بلند کرنا اس کے لیے زیب نہیں۔ ایک طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صنف نازک مظلوم ہے۔ اسے زندگی کو جینے کے لیے ہزاروں بار موت کا مزہ چکھنا ہوگا جو اس طرح سے مر مر کے جینے سے بہتر ہوگا۔ انہیں معلوم ہے کہ سماج نے ہمارے لیے جو اصول بنائے ہیں اس کا سروکار صلیب سے جاملتا ہے۔ جدید معاشرہ بھی اس لائق نہیں جو ان کی مکمل آزادی کا سہارا بن سکے۔ اگر عورت اپنے دل میں عشق کا جذبہ رکھتی ہے تو اس کا اظہار اس کے لیے جرم

ہے۔ معاشرہ کے لیے اس کا وجود ثانوی ہے۔ اسے ہر طرح کی مشکلات، کرب اور طنز کو برداشت کرتے ہوئے ہر حال میں سماج میں رہنا ہے اور زندگی کو ایک قفس میں محدود اور غلام بنا کر رکھنا ہوگا۔ اپنے محبوب سے وہ اشاروں اشاروں میں کہتی ہیں کہ وہ میری نگاہوں اور لبوں کی جنبش ہی سے بات کو سمجھے کیونکہ یہاں لب کھولنا ایک جرم ہے اور معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔

جنبش ہی سے ہونٹوں کی جو کچھ سمجھو تو سمجھو
اس گنگ محل میں نوس اشنا ہی روا تھا

بچپن سے سب سہنے کی عادت ماں نے ڈالی تھی۔

میں زندگی میں مروں گی نہ جانے کتنی بار
مجھے خبر ہے کہ رشتے مرے صلیب سے ہیں

شبنم کو اس بات کا بھی غم ہے کہ اس درد کا مداوا نہ ہوسکا۔ ان کی تمنائیں دل میں پیدا ہوئیں اور وہیں مدفون ہوگئیں۔ اس کی محبت میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہوسکا۔ اسے یہ حسرت ہی رہی کہ اس کے لیے کوئی آنسوؤں کے ایک دو بوند چھلکاتا تو شاید قلبِ جگر کو سکون ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا جس کا انھوں نے خواب دیکھا اور امید کی۔ اس کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

مری ہی گود میں سر رکھ بڑے پیار کے ساتھ
سب جواں سال تمناؤں نے دم توڑ دیا

ہے چشمِ گل میں درد کی شبنم مرے لیے
حسرت تھی کوئی آنکھ تو ہو نم مرے لیے

زہرہ نگاہ

آزادی کے بعد شعری منظرنامے پر نمودار ہونے والی فنکارانہ قابلیت سے اپنی طرف توجہ کرانے میں ایک نام زہرہ نگاہ کا ہے۔ ''شام کا پہلا تارا'' زہرہ نگاہ کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں نجی اور ذاتی کرب کے ساتھ ساتھ اجتماعی مسائل کی داستان بھی ہے۔ کوچۂ عشق سے میدان

میں سیاست کی محلاتی سازش کا رنگ اور جذبہ دونوں کی ایک خوبصورت آمیزش ملتی ہے اور یہی ان کی شاعری کا وصف بھی ہے جو انہیں اوروں سے مختلف کرتا ہے اور ادب میں ایک اہم مقام مہیا کراتا ہے۔

زہرہ نے ابتدا سے اپنی چھاپ دنیائے ادب میں چھوڑی۔ انہیں نظموں کے ساتھ غزلوں پر بھی اچھی گرفت ہے۔ ان کے یہاں عصری آگہی اور غم ذات کی روداد ملتی ہے ان کی نظم ''نائٹ شفٹ'' ایک اچھی نظم ہے اس میں عالمی مزدوروں کی علامت ہے۔ ''ایک لڑکی'' زہرہ کی خوبصورت نظموں میں سے ایک ہے جسے سماج ایک طوائف کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زہرہ کی غزلیں حکایت دل کے ساتھ ساتھ حکایت دنیا کی بھی ترجمان ہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے کرب ناک حقائق کی تصویر ملتی ہے لیکن لہجے کی شیرینی اس میں موسیقی کا رنگ بھر دیتی ہے۔ ابتدا میں غزلوں کو ہی سنوارتی ہیں۔ جوں جوں شعور کی لَو تیز ہوئی تو وہ نظموں کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ان کی غزلوں میں ماں کی ممتا، زندگی کی بے چینی، ظلم و استحصال کی مخالفت اور سیاست کی بازی گری کے نقش بھی ملتے ہیں۔ اہل اقدار سے انہیں بہت دکھ پہنچا۔ آزادی سے قبل ملک اور قوم کے بارے میں جو بشارتیں دی جاتی رہیں، جس خوبصورت جہان کی تصویر دکھائی جاتی رہی، درد کی رات میں جس صبح کی بات کی جانے لگی وہ صبح کبھی نہیں آئی بلکہ اس درد کی رات سے بھیانک صبح سامنے کھڑی دیکھ کر زہرہ چیخ اٹھیں۔ اس ضمن کا یہ شعر دیکھیے۔

جہانِ نو کا تصور، حیات نو کا خیال
بڑے فریب دیے تم نے بندگی کے لیے

کہاں کے عشق و محبت، کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

ان آنکھوں سے کیوں صبح کا سورج ہے گریزاں
جن آنکھوں نے راتوں میں ستاروں کو چنا تھا

زہرہ نگاہ نرم نازک احساس کو برتنے میں کمال رکھتی ہیں۔ تلخ سے تلخ موضوع میں نغمگی پیدا کرتی ہیں۔ فطرتاً زہرہ خوبصورت اور شیریں آواز کی مالک تھیں اور وہی شیرینی ان کے کلام میں بھی اُتر آئی ہے۔ ان کی غزلیں ایک کمسن لڑکی کے جذبات کی ترجمان ہیں۔ اس کمسن عمر کا تقاضہ ہی ہے کہ لطیف احساسات اچھے لگتے ہیں۔ آنکھوں کو خواب پیارے لگتے ہیں۔ ان کے دل کو جو پیارا لگتا ہے اسے بھولنا نہیں چاہتیں غزلوں میں نسائی جذبہ نسائی لہجے کے ساتھ موجود ہے۔

آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل پر امید کا تارا ٹانکا تھا

ہوا سکھی تھی میری، رُت ہمجولی تھی
ہم تینوں نے مل کر کیا کیا سوچا تھا

فیض احمد فیض نے شعری مجموعہ ''شام کا پہلا تارا'' کے دیباچے میں بڑے ہی پتے کی بات کہی ہے:

''ان منظومات میں نہ جدیدیت کے غیر شاعرانہ جذبات کا پرتو ہے اور نہ رومانیت کی شاعرانہ آرائش پسندی کا کوئی دخل ہے۔ روایتی نقش و نگار اور آرائشی رنگ و روغن کا سہارا لیے بغیر دل پر لگتا ہوا شعر کہنا بہت دل گردے کا کام ہے۔'' (بحوالہ 'شام کا پہلا تارا' (مجموعہ)، زہرہ نگاہ، ص:۸)

ان کے بہت سے اشعار پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات اور مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہے گئے ہیں۔

نقاب چہرۂ شب اُٹھ چکا مگر پھر بھی
اداس اداس اُجالے بجھی بجھی ہے سحر

گردش مینا و جام دیکھئے کب تک رہے
ہم پر تقاضا حرام دیکھئے کب تک رہے

زہرہ کی نظموں اور غزلوں کے مطالعے سے اکثر جگہوں پر فیض احمد فیض کے کلام سے

استفادہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں پہلے شعر پر فیض احمد فیض کی کامیاب نظم ''کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں'' سے پوری طرح نہ سہی مگر کسی حد تک رجحانات اور بنیادی لفظیات سے زہرہ نے استفادہ ضرور کیا ہے۔ حالانکہ دوسرے باقی اشعار میں تقسیم وطن کے بعد نئی نسل جس ماحول و مسائل اور حوادثات کا شکار ہوئی ہے اس کا خوبصورت اظہار ہے اور اس نسل کے ذہنی رویے کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ارباب اقدار سے بے اطمینانی اس بات کی غماز ہے کہ ان سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں۔ خوشگوار زندگی کی آرزو اور حالات کی ستم گری کی شکایت صرف زہرہ کا معاملہ نہیں بلکہ ان کے دیگر ہمعصروں کے یہاں بھی ملتی ہے۔

زہرہ کے غزلیہ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف حالات سے آگاہ ہیں بلکہ اس ماحول میں ہونے والی دوسری نئی تبدیلیوں کا علم بھی رکھتی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس پر کلام کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ زہرہ عورت کے اچھے اور خوشگوار لمحات اور اس کی تانیثیت کو فراموش نہیں کرتیں۔ وہ ان خوشگوار پل کو بڑے ہی فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں۔ جیسے

ہاتھوں کی بانکپن چھن چھن ہنستی تھیں
پیروں کی جھانجھن کو غصہ آتا تھا

زہرہ کی نظموں میں ان کی بے باکی، فنی خوبیاں اور ہنرمندیاں غزلوں کے مقابلے زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آزادیٔ نسواں کا نعرہ زہرہ کے نزدیک دلفریب طلسم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ آزادی کے نام پر عورت کا ہمیشہ استحصال کیا گیا ہے۔ مغرب و مشرق کی فضاؤں کو اسی دلفریب نعرے کے ذریعے اسیر کرنا چاہتا ہے۔ ''بن باس''، ''تراشیدم''، ''گل چاندنی''، ''سمجھوتہ'' اور ''آج غمگین نہیں حیراں ہوں میں'' جیسی نظمیں اس کی ابتدا میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ زہرہ نگاہ کی یہ نظمیں دراصل نسائی جذبات کی بہترین عکاس ہیں۔ نظم ''سمجھوتہ'' کے چند مصرعے پیش دیکھیں:

ملائم گرم سمجھوتہ کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں

کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اُٹھا لیں گے تو گر جائے گا چلمن

زہرہ کے یہاں زبان و بیان میں نہایت سلاست، ہیئت و موضوع میں روایت سے بغاوت اور جا بجا نسائی لہجہ ملتا ہے۔ تلخ سے تلخ حقیقت کو نرم لہجے میں ادا کرنے کا سلیقہ امور کلام میں موسیقی ملتی ہے۔ یہی خصوصیات و انفرادیت انہیں اوروں سے مختلف کرتی ہیں۔ اس ضمن میں جو شاعرات آگے چل کر شعری روایت کو برقرار رکھتی ہیں ان میں کشور ناہید کا نام سرفہرست ہے۔

کشور ناہید

جدید شاعری کے حوالے سے بات کریں تو اس عہد میں کشور ناہید ایک بڑا و مقبول نام ہے۔ انہوں نے اپنے اظہار کے لیے نظم کو اوّلیت دی ہے لیکن غزل سے انحراف بھی نہیں کیا۔ مشکل زمینوں میں شعر کہہ کے انہوں نے اپنے موزوں طبع ہونے کا جواز پیش نہیں کیا اور نہ یہ اعتماد کرانے کی کوشش کی ہے کہ وہ غزلیہ شاعری بھی کر سکتی ہیں بلکہ ان کے غزلیہ اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان میں صرف قافیہ پیمائی ہی نہیں ہے بلکہ ندرت اور معنی آفرینی کے نقوش بھی ہیں۔ بقول نجمہ رحمانی:

> ''کشور ناہید کی شاعری گھر آنگن کی شاعری ہے جس کے ذریعہ انہوں نے مشرق کی نئی عورت سے متعارف کرایا۔''
>
> (آزادی کے بعد اردو شاعرات: نجمہ رحمانی)

دراصل کشور ناہید کی شاعری میں ہمیں ان عورتوں سے بھی آگہی ہوتی ہے جو اپنے محبوب

کی ذات میں فنا ہو کر بھی اپنی ذات کو گم نہیں کرنا چاہتیں بلکہ اس کی شناخت اپنی ذات کے حوالے سے چاہتی ہیں۔ یہ مرحلہ دشوار ہی نہیں بلکہ بہت مشکل ہے لیکن شناخت تو اسی اذیت کا نام ہے۔اس کے مدنظر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شناخت نام ہے شاید اسی اذیت کا
کہ پانیوں میں رہو رنگ بھی جدا رکھو

یہی ذاتی شناخت کشور ناہید کے لیے عذاب جاں بن گیا کیونکہ وہ زندگی کو ہمیشہ اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتی ہیں۔ کشور کی شاعری میں اس طرح کے احساس و جذبات ''لب گویا'' سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں بدل ڈالوں وفاؤں کی جنوں سامانی
میں اسے چاہوں تو خود اپنی خبر سے چاہوں

چھپا کے رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں

میں نظر آؤں ہر اک سمت جدھر سے چاہوں
یہ گواہی میں ہر اک آئینہ گر سے چاہوں

مجھ سے بچھڑے گا تو رسوا ہوگا
میرے دشمن، ترا پردہ ہوں گے

یہ چند اشعار اُس عورت کی ترجمانی کر رہے ہیں جو اپنے اطراف و جوانب کو مرد کی نہیں بلکہ اپنی نظر سے دیکھ رہی ہے جسے دنیا کو جاننے اور پرکھنے کی شدید تمنا ہے۔ زندگی کے تاریک گوشوں کو جاننے کی کوشش اس احساس کے باوجود بھی جاری ہے۔

کشور ناہید کی انفرادیت موضوع، اسلوب اور زاویۂ نظر میں بھی نمایاں ہے۔ زبان و ادب سے غیر معمولی آگہی اور واقفیت نے ان کو اس منصب پر سرفراز کیا ہے۔ مشرقی اور مغربی دونوں علوم سے ان کا استفادہ ہے اور اردو کے ساتھ انگریزی اور فارسی زبان پر بھی انہیں

قدرت حاصل ہے۔ ان ساری خوبیوں نے ان کی غزلیہ شاعری کو جدید و قدیم کے ایک حسین امتزاج کا رنگ دے دیا۔

جدید شعراء کی طرح کشور ناہید بھی اپنی شاعری میں نفسیاتی گتھیاں کھولتی ہیں کیونکہ جدید شعراء کا یہ ماننا ہے کہ ذہنی اور جذباتی کشمکش سے چھٹکارا پانے کے لیے نفسیات کا علم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ کشور ناہید نے اس نفسیاتی مفروضے سے فائدہ اٹھایا اور حقیقتوں کا اظہار بلا جھجک کیا جن کی معاشرہ اجازت نہیں دیتا ہے۔ میرا جی نے بھی یہ اقدام کیا تھا لیکن کشور ناہید تک آتے آتے بہت سی سماجی اور سیاسی زنجیریں خود بہ خود کمزور ہوتی چلی گئیں۔ انہوں نے حقائق کے اظہار میں بیباکی سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظم جس میں حقائق کا اظہار برملا کیا گیا ہے۔

ڈر بالک کا یا ہردے کا
دونوں میں خوں رنگ اندھیرا
ہونٹوں پہ سرد سویرا
بات بھی کرتے ہم ڈرتے ہیں
تجھ سے ملتے ہم ڈرتے ہیں
سانس بھی لیتے ہم ڈرتے ہیں
کیسی محبت، کیسی چاہت
پھول بھی چنتے ہم ڈرتے ہیں
جھانک کے دیکھیں ہم سائے میں
کیا ڈر دیو وہاں بھی
اپنے دانت گاڑ کر چھوڑ گیا ہے

بقول شمیم حنفی:

"کشور ناہید کے فنی ادراک و احساس کی رفتار خاصی تیز رہی ہے، تاہم اُس پر کسی انہونی کا گمان نہیں ہوتا کہ پچھلے بیس پچیس برسوں میں زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز رہی ہے۔ مغرب نے تو خیر شعر کی جمالیات کو قلم اور روشنائی

سے ٹائپ رائٹرز اور کاربن تک پہنچا دیا اور سنگیت کاروں نے انسانی دل کے دھڑکنے کی آواز بھی دھات کے بنے ساز سے نکال لی، لیکن کشور نے تغیرات کے شور شرابے میں گھری دنیا سے اپنی وابستگی کے ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کا آہنگ محفوظ رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے نظم سے زیادہ موزوں غزل کی صنف تھی۔ کشور کی شاعری میں غزل اور نظم کے رنگوں کا فرق صاف ہے۔ نظم میں لہجے کی عجمیت، غزل کے برعکس، بتدریج کم ہونے کی بجائے، ایک بڑی حسیت کی طالب تھی۔"

(دائروں میں پھیلی لکیر، پیش لفظ: کشور ناہید)

"فرشِ ناخن"، "اندیشہ ہائے گفتنی"، "قدح خوار"، "رخشِ شوق"، "واقفِ دید وشنید"، دمِ عیسیٰ"، "جمالِ آئینہ" اور ریگ رواں جیسی ترکیبیں جدید شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ دیکھیے ان اشعار کو۔

بے سبب ہوں گے ترے گھر میں موجود
کوئی کھویا ہوا بچہ ہوں میں
جھانک لو غار ہوں جالوں سے تنا
دیکھ تو طاق پہ تماشہ ہوں میں

ہیں بہت تیرے شناسا لیکن
تری دہلیز پہ تنہا ہوں میں

مذکورہ بالا اشعار کو صرف جدید نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ اشعار غزل کی کلاسیکی روایت سے متعلق ہیں جو اردو غزل کے گہرے مطالعے کے بغیر نہیں کہے جاسکتے۔ بقول نجمہ رحمانی:

"لب گویا" کے بعد جب "گلیاں دھوپ دروازے" اور "مسافتوں کے درمیان" کی غزلیں سامنے آئیں تو دل میں ایک واضح تبدیلی ہو چکی تھی۔ یہ تبدیلی فکر سے بھی تعلق رکھتی تھی اور زبان و بیان سے بھی۔ "لب گویا" کی بہ نسبت بعد کے مجموعوں کی غزلیات میں کشور ناہید نے سادگی کو ملحوظ نظر رکھا ہے۔ اولین مجموعوں کی کمسن اور ناتجربہ کار لڑکی اب ایک باشعور عورت

کے روپ میں نظر آتی ہے۔ جو زندگی کے تلخ تجربات سے گزر کر آئی ہے
جو سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ
غزلیات دراصل ان کے ذہنی ارتقاء کی نشاندہی کرتی ہیں۔"

(آزادی کے بعد اردو شاعرات، نجمہ رحمانی، ص:۷۹-۸۰)

اب کچھ کچھ سمجھی ہے دنیا کو ناہید
اب کی بار نہیں مانی بہلانے سے

ایک پوری غزل میں کشور ناہید عورت کے جذبات کی کشمکش، اس کے احساس اور اپنی شناخت کو غزل کا ایسا منفرد لہجہ عطا کرتی ہیں کہ اسے بار بار پڑھنے کی خواہش جاگتی ہے۔

ستم شناس ہوں لیکن زبان بریدہ ہوں — میں اپنی پیاس کی تصویر بن کے زندہ ہوں
طلب کی زشت نے دیوانگی مقدر کی — شفق کے روپ میں، میں رنگ آبدیدہ ہوں
علاج صرف شنیدہ کا کس سے ہو جائے — ورق ورق ہوں مگر حسرت امیدہ ہوں
شہید جذبوں کی قبریں سجا کے کیا ہوگا — کھنڈر ہوں، قامت شب ہوں، بدن دریدہ ہوں
وہ ماہ وسال کی شاخوں میں چھپ کے دیکھتا ہے — میں آئینے میں اسے دیکھ کے تپیدہ ہوں

اس غزل کے اشعار میں جذبات واحساس کی شدت کے ساتھ ساتھ معنی کی ایک زیریں لہر بھی ہے۔ ندرت اور تغزل سے بھرپور یہ اشعار ایک خاص طرح کے رویے اور سوچ کی ہی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہمارے معاشرے اور سماج کو آئینہ دکھا رہے ہیں جس میں عورت سب کچھ ہے مگر عورت نہیں۔

کشور ناہید کی شاعری میں جو باتیں انہیں اجنبی ہونے سے بچاتی ہیں وہ ان کا انداز نسائی ہے جس میں جذبات کی نزاکت اور اپنی زمین سے وابستگی کا عنصر نظر آتا ہے ان کی شعری شخصیت بنیادی طور پر نسائی جوہر سے آراستہ ہے جس میں محبت کرنے اور محبت پانے کا شدید جذبہ موجود ہے۔ عورت ہونے کی وجہ سے کشور اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح سے واقف ہیں اور ایک مکمل عورت کی طرح ہمارے سامنے آتی ہیں جس میں جذبات کے ساتھ ساتھ ذہنی بیداری اور دانشوری کا عنصر بھی موجود ہے۔ وہ معاشرے کے پیچیدہ مسائل و حالات سے لڑتی اور ان کو سلجھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کشور ناہید اپنے عہد کی ایک ایسی شاعرہ ہیں جو زندگی اور فطرت کے پیکروں سے کائنات کی اصلیت کو منکشف کرتی ہیں اس سلسلے میں ان کا لہجہ اور انداز بیان جادو کا کام کرتا ہے کیونکہ یہ بہت پیچیدہ اور اس کے معنی میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔

نجمہ رحمانی ''آزادی کے بعد اردو شاعرات'' میں لکھتی ہیں:

> ''اپنی غزلیہ شاعری میں کشور ناہید نے عورت کے مختلف زاویوں کی جیتی جاگتی تصویر کی طرح روشن رکھنے کی بھی سعی کی ہے۔''

کوئی بھولا ہوا گھر آئے گا   آج ایک بلبلا آٹے میں تھا

کچھ یوں زرد زرد ناہید آج تھی   کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا

پھول سا جسم دہکنے لگا شعلے کی طرح   دل تری یاد کو بھی فصل کا ساماں سمجھا

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کی دبی آگ   مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں

ہماری عمر تو ہے بیل عشق پیچاں کی   ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا

مندرجہ بالا اشعار میں جذبہ و احساس کی ان مخصوص صورتوں کو پیش کیا گیا ہے جو عورت ذات کی مظہر ہے۔

کشور ناہید کی غزلیہ شاعری میں نسائی جذبات اور ساتھ میں اس عہد کا کرب بھی شامل ہے جو غزل کے فنی امکانات کے ساتھ ساتھ جدید تخلیقی حسیت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ وہ جہاں نسائی حقوق اور مرد کی روایتی بالادستی کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں وہیں ارباب اقتدار کے جبر و تشدد اور آمریت کے خلاف بھی صدا بلند کرتی ہیں۔

طلب کی پیاس کو پھولوں میں بانٹ دیتا تھا
وہ خواب میں بھی مرے لب پہ اوس رکھتا تھا

بدن کو سر سے جدا دیکھنے کی فصل ہے یہ
نجیبِ شہر کا گلشن سے دوستانہ تھا

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

اَنگنت لوگوں کی چاہت نے اسے دھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صورت کو بدلتا جائے

اب تو بدن جلنے کی بو شہر بھر میں ہے
کہنا بھی ناروا ہے، سو کہتا نہیں کوئی

کشور ناہید نے لفظوں کے ذریعے نئے مرکبات تشکیل کئے ہیں۔ وہ دو لفظوں کو اضافت سے جوڑ کر ایسے مرکبات پیش کرتی ہیں جو معجزاتی امکانات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ عمل فارسی رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ کشور کی دو اہم لسانی خصوصیات ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بڑی سے بڑی بات کہنے کے لیے بھی تقلیل الفاظ سے کام لیتی ہیں جن سے ان کا اسلوب زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ان کے الفاظ جامد اور غیر متحرک نہیں ہوتے بلکہ لہجے اور فضا کے ساتھ حرکت پذیر رہتے ہیں۔

اپنے تخلیقی سفر میں کشور ناہید نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی تجربے کیے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ نظم کی ہی شاعرہ ہیں۔ ان کی تخلیقی بصیرت کے بہت سے باب پوری طرح سے اور تفصیل کے ساتھ ان کی نظموں میں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ''لب گویا'' سے ''سیاہ حاشئے میں گلابی رنگ'' تک کی تخلیقی سرگرمیوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کشور ناہید کی نظموں کا ایک بڑا وصف خود آگہی اور سرکشی ہے۔ وہ ایسی عورت کی تصویر کشی میں مصروف ہیں جو مقدر کے بجائے اپنی طاقت اور قوت پر بھروسہ کرتی ہے۔ فرسودہ روایات اور نظام پر مبنی سماج سے وہ چھٹکارا چاہتی ہے اور نئے نظام کے قیام کے لیے مسلسل مصروف رہتی ہے۔

اُٹھو اور بھلا دو

وہ بے مہر ساعت
کہ جس نے بجھی خلوتوں کی سیاہی کو
حد تک کی چندھیانے والی شعاعوں سے
پگھلے ہوئے برف کی شکل میں
بہہ نکلنے کے ہر راستے خرد زار سنگِ ملامت سے اَٹ کر

سلامت گہہ خواب کو روند ڈالا

(سلامت گہہ خواب)

ایک دوسری نظم ''میں کون ہوں'' میں کشور ناہید نے ان ہوس نگاہوں کے خلاف بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا ہے جو آزادیٔ نسواں کے نام پر عورت کا استحصال کرتے ہیں اور عورت کے جسم اور اس کی آواز کو تجارت اور چمکانے کا ذریعہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہی نفرت جب اپنی شدت کو پہنچ جاتی ہے تو ''تر الٹیا شہر بھنبھور'' کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے:

نیند نہیں آتی
بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی
میں ستارے گنتے گنتے
یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی
تو تمہیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے

(تر الٹیا شہر بھنبھور)

نظم ''آخری فیصلہ'' کا یہ بند بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

موجود سے انکار بھی
تو قتل کے مترادف ہوتا ہے
میرا جی کرتا ہے
وہ سب جو میرے قاتل ہیں
میں انہیں
ہوا کی طرح نگل جاؤں

(آخری فیصلہ)

کشور ناہید کی ایک خوبصورت نظم ''نیلام گھر'' ہے جس میں انہوں نے مرد کے عورت پر مالکانہ حق، جو رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے، کو مرکز بنا کر پیش کیا ہے:

ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر
زوج بنتے ہیں

نفرتوں کی جھیل میں پاؤں لٹکا کر بیٹھنے سے
ہاتھوں پہ لکھی عزلتوں کی سیاہیاں ڈھل تو نہیں جاتی ہیں
ہاں مسافتوں کی مایوسیوں کی مٹی
اپنا آپ چھوڑ دیتی ہے
تپے ہوئے تنور سے جس طرح پھولی ہوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں
میرے منہ پر طمانچہ مار کر
تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشاں
پھولی ہوئی روٹی کی طرح
میرے منہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں
تم حق والے لوگ
تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے

(نیلام گھر)

کشور ناہید نے ''نائیٹ میئر''، ''زخم'' اور ''خلوت'' جیسی نظمیں لکھ کر اپنی زندہ دلی کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ سیاسی حالات سے آگہی بھی فراہم کی ہے:

''کشور کی شاعری میں تبدیلی سے زیادہ نمایاں عمل انجذاب اور دریافت کا ہے۔ اسے دیکھتے وقت ہم یہ بھی محسوس کرتے جاتے ہیں کہ تجربوں کی نئی فصل کے ساتھ باطن کا منظر بھی پہلے جیسا نہیں رہا۔ ذہن اور حواس متحرک ہوں تو اس تحرک کی چھاپ شعر پر لازماً پڑتی ہے۔ ایک اور پہلو جو اسی مسئلے سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ حسیت کے سفر میں لکھنے والا نئی دریافت کے ساتھ ساتھ، اپنی حسیت کے کچھ پرانے عناصر سے دست بردار بھی ہوتا جاتا ہے۔'' ('انتخاب دائروں میں پھیلی لکیر' پیش لفظ)

ڈاکٹر سلیم احمد نے لکھا ہے کہ:

''کشور ناہید کی نظموں کے تجربات میں وسعت بھی ہے اور تنوع بھی، پھر بھی وہ بہت سے نقوش کو ملا کر ایک نقش بنانا چاہتی ہے۔''

(نئے زمانے کی برہن، مرتب: اصغر ندیم سید افضال احمد، ص:۲۹)

کشور ناہید کی طویل نظم ''پیدائش سے پہلے کی تاریخ'' میں اس عہد کی یاد دلاتی ہے جب ہمارے معاشرہ میں مادرانہ نظام نافذ تھا۔ لکھتی ہیں:

میری پیدائش سے پہلے وعدہ کرو
مجھے اس پانی کے قریب نہیں لے جاؤ گے
جو کھیتوں کے بجائے گھروں میں پھیل جانے کو بڑھتا ہے
اس دھوپ کی پہچان نہیں کراؤ گے
جو قحط بن کر میرے جیسے آنگنوں کو بھوک میں بدل دیتی ہے
جب کہ ہم گنہ گار عورتیں پدرانہ نظام کے مظالم کی یاد دلاتے ہیں
یہ گنہ گار عورتیں ہیں

باقر مہدی کشور ناہید کی شاعری کا مجموعی جائزہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''وہ (کشور ناہید) ایک ارتقاء پذیر شعری شخصیت رکھتی ہیں اور مغربی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود ایک مشرقی عورت کے ذہن ونظر سے سوچتی ہیں۔ حالات، ماحول، خیالات و جذبات کو پرکھنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ جب ہی تو ان کے مجموعے مسلسل رفتار بلندی اور عمق کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک اہم حصہ احتجاجی ہے اور یہ شاعری حالات کے بدلتے ہی ادبی کم اور تاریخی اہمیت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے، مگر کشور کی احتجاجی آواز انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی صداقتوں کی علمبردار بھی ہے، یہی نہیں اردو شاعری میں کشور ناہید کا لب ولہجہ اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے، جبھی تو آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔''

(نئے زمانے کی برہن، مرتب: ندیم سید، افضال احمد، ص:۱۰۱-۱۰۲)

فہمیدہ ریاض

فہمیدہ نے جب شاعری کی شروعات کی تو اس وقت تک فیض احمد فیض ترقی پسندانہ روایت کے زیر اثر اپنے مخصوص لب ولہجہ میں احتجاجی شاعری کر رہے تھے۔ فہمیدہ ریاض فیض

سے کافی متاثر تھیں اور ان کی شخصیت کا اثر فہمیدہ کی شاعری اور ان کی ذات پر پڑتا ہے۔
۱۹۶۰ء کے بعد شروع ہونے والی جدید شاعری کے اثرات بھی انہوں نے قبول کیے۔ انگریزی ادب اور دوسری زبانوں کے مطالعے یورپ اور امریکہ کے علاوہ ایشیاء کے مختلف خطوں اور علاقوں میں قیام اور وہاں کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورتِ حال کے مشاہدے اور مطالعے نے بھی ان کی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران ''وجودیت'' کی تحریک سے کافی متاثر ہوئیں۔

فہمیدہ نے اپنی شاعری میں سیاسی اور سماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ سائنسی اور میکانکی موضوعات، مناظر فطرت۔ انسان دوستی اور انسانیت کے علاوہ نفسیاتی اور جنسی موضوعات کو بھی اپنی فکر کا عنصر بنایا ہے لیکن ان کی شاعری کی مرکزی فکر ''عورت'' اور اس سے متعلق مسائل ہیں۔ ان کے یہاں عورت سے متعلق مختلف موضوعات پر کثرت سے لکھا گیا ہے۔

اگر فہمیدہ کے کلام کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو عورت کی حسیت کے تعلق سے ان کے یہاں فکری ارتقاء واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ''پتھر کی زبان'' سے ''آدمی کی زندگی'' تک کے سفر میں ایک نوعمر لڑکی سے ایک بھرپور اور مکمل عورت بننے کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ حالانکہ موضوعات کے تنوع اور زبان و بیان میں تبدیلی کے سبب ان کے سارے مجموعے جدا جدا نظر آتے ہیں لیکن ''عورت کی حسیت کا اظہار'' ایک ایسی لڑکی ہے جو ان کی شاعری میں تسلسل قائم کرتی ہے۔ ''پتھر کی زبان'' میں ایک جگہ فہمیدہ فرماتی ہیں۔

یہ میری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے نظریں کترا کے نکل جاتی ہے

('جھجک' پتھر کی زبان)

ان کی فکری تسلسل کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم ''آخری بار'' بھی بہت اہم ہے۔ اس کی ابتدا بھی مایوسی اور ہار مان لینے کے خیال کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اختتام سے اندازہ ہوتا ہے کہ دل کسی طرح حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے راضی نہیں ہے۔

تھرتھراتے لبوں سے دے کے دعا

عمر بھر کے لیے وداع کیا

مگر اب تک یہ سوچ ہے دل میں

ان سے اک بار اور مل آئیں

('آخری بار' پتھر کی زبان)

''بدن دریدہ'' سے فہمیدہ کی شاعری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ فہمیدہ کے اس دور کو ہم ایک نئے فکر و شعور کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ذریعہ انہوں نے معاشرے کے باطن کو دیکھا اور سماج کے ظاہری رکھ رکھاؤ کے سارے گوشے کو ہلا کر رکھ دیا۔ اپنے نشتری لہجے میں حمیت و جرأت کا مظاہرہ کسی نے نہیں کیا تھا، غالباً اسی وجہ سے ''بدن دریدہ'' کی اشاعت پر ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور گفتگو کا موضوع بن گئی۔

لمبی رانوں سے اوپر

ابھرے پستانوں سے اوپر

پیچیدہ کوکھ سے اوپر

اقلیما کا سر بھی ہے

اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے

اور کچھ پوچھے!

('اقلیما' بدن دریدہ)

ڈاکٹر سلیم اختر فرماتے ہیں کہ:

''فہمیدہ کی ''بدن دریدہ'' نے جو غل مچایا ہے اس کے نتیجے میں وہ بے ضرر شاعرات کی جھرمٹ سے منفرد ہو کر متنازعہ شخصیت بن گئیں۔ طہارت پسندوں کی مطعون اخلاق پرستوں کی معتوب مگر سچے قارئین کی محبوب فہمیدہ ریاض معاصر شعراء میں ایک معتبر نام قرار پائیں۔ ابھی نزاعات کی گونج کم نہ ہوئی تھی کہ اپنے عصر سے اس کا کمٹ منٹ کا اظہار ایسی نظموں کی صورت میں ہوا جن میں الفاظ کی جگہ گویا کیکٹس استعمال کیے گئے تھے

اور یوں نزاعات کی شدت اور آرا کی تلخی میں مزید اضافہ ہوگیا۔"

(پاکستانی اردو ادب، ڈاکٹر سلیم اختر، ص:۹۶)

زندگی کی تلخیوں کا بیان بھی فہمیدہ ریاض کے یہاں بکثرت ملتا ہے۔ وہ نرم، سریلے، میٹھے لہجے میں کڑوی حقیقتیں نظم کرتی ہیں اور بڑے ہی اچھے انداز سے اپنے دل کی بات کو کہہ ڈالتی ہیں۔ جیسے

مرے دل کے نہاں خانے میں اک تصویر ہے میری
خدا جانے اسے کس نے بنایا، کب بنایا تھا
یہ پوشیدہ ہے میرے دوستوں سے اور مجھ سے بھی
کبھی بھولے سے لیکن میں اسے گر دیکھ لیتی ہوں
اسے خود سے ملاؤں تو میرا دل کانپ جاتا ہے

(نظم: 'تصویر' بدن دریدہ)

فہمیدہ ذاتی تجربات کے اظہار میں جس بیبا کی اور درشتی کا مظاہرہ کرتی ہیں اس میں ایک والہانہ پن ہے اور جو روایتی قسم کی شاعری کے مزاج سے مکمل انحراف کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں اپنے حمل کا بوجھ لیے
دھرتی کو ڈھونڈتی آئی
پر دھرتی کہاں ہے میں جس پہ یہ بوجھ لے کر بیٹھ سکوں
وہ جنموں کی سنگی میری
جس کی مٹی میں جذب ہوا تھا دودھ میرا
وہ جس کی اتھاہ گہرائی میں بیکل ہیں نمو کی تحریکیں

('پلاٹ': بدن دریدہ)

اگر ہم فہمیدہ کو شاعرات کی نمائندہ کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ شاعرات کے برخلاف فہمیدہ کے یہاں جذبوں کی بے حجابی کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔ سیاسی رجحانات کی فراوانی، افکار کی عریانی اور حقوق نسواں کے بے باکانہ اظہار نے ان کی شاعری کو ایک بلند آہنگ نسائی لب ولہجہ ضرور عطا کر دیا ہے، البتہ ان مسائل حیات اور تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے اظہار میں فہمیدہ کی

شاعری جمالیاتی لے اور آہنگ کو برقرار رکھتی ہے جو بہرحال ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

وہ خواہش بوسہ بھی نہیں اب
حیرت سے ہونٹ کاٹتی ہوں
ہاں مرے خمیر میں کجی تھی
اب خوش ہوں کہ بھٹک رہی ہوں

نئے شعراء کی طرح فہمیدہ نے بھی اپنی شاعری میں ایسے باطنی اور ذہنی تضادات کو پیش کیا ہے جو مختلف نفسیاتی پیچیدگیوں کے باعث ہوتے ہیں اور سماجی ضابطوں میں حائل ہوتے ہیں۔ فہمیدہ نے نظموں اور غزلوں دونوں اصناف سخن کو برتا لیکن ان کے کامیاب شعری تجربات نظموں میں اجاگر ہوئے ہیں۔ یہاں پر نظر صدیقی رقمطراز ہیں۔ فرماتے ہیں:

"فہمیدہ ریاض کو غزل گوئی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن ان کے بعض شعروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ سنجیدگی سے غزل گوئی کی طرف مائل ہوتیں تو غزل میں بھی اپنے لیے جگہ بنا لیتیں۔ "پتھر کی زبان" جوان کی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں ایک نظم "مدت سے ہے یہ عالم دل کا" ایسی ہے جس پر غزل کا دھوکہ ہوتا ہے ورنہ ان کی غزلوں پر نظموں کا گمان ہوتا ہے۔" (جدید اردو غزل- ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، ص: ۱۲۴-۱۲۵)

اس سے متعلق یہ شعر ملاحظہ ہو:

تزئین لب و گیسو کیسی پندار کا شیشہ ٹوٹ گیا
تھی جس کے لیے سب آرائش، اس نے تو ہمیں دیکھا بھی نہیں

(مجموعہ 'پتھر کی زبان'، نظم: مدت سے ہے یہ عالم دل کا)

فہمیدہ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عورت کے تجربات کو انتہائی بیباک اظہار سے مربوط کر کے اور ان کا رشتہ زندگی کے رنگارنگ پہلوؤں سے قائم کر کے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں خواتین کے مختلف رویوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ فہمیدہ نے خواتین کے خصوصی مسائل کے بیان میں شرم و حیا کی اُن ساری چادروں کو اُتار کر پھینکا ہے۔ جو اب تک شاعرات کسی نہ کسی سطح پر پہنے ہوئے ہوتی تھیں۔ مرد اساس معاشرے میں عورت کی بے وقعتی

اور مظالم کے خلاف فہمیدہ پوری جرأت کے ساتھ آواز بلند کرتی ہیں۔ دراصل فہمیدہ کو عورتوں کے حقوق کے تئیں ایک شدید تڑپ اور احساس ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ سماج میں ہر طرح کی آزادی کے بعد بھی عورت کو اس کا حق نہیں ملتا۔ وہ محض جنسی تسکین کا ایک خوبصورت ذریعہ ہیں۔ ورنہ کیا بات ہے کہ خواتین کو ہر عہد اور ہر زمانے میں اپنی وفا اور تقدس کے لیے سخت ترین مراحل اور امتحانات سے گزرنا پڑا مگر اس کے بعد بھی وہ ان حقوق سے محروم ہے جس کے اظہار میں مرد اساس معاشرے کی زبان نہیں تھکتی۔ عدم مساوات اور نابرابری کے خلاف فہمیدہ نے بہت لکھا ہے۔

اُس کی اُبلی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ہے چمک
اور سیہ بال ہیں بھیگے ہوئے خوں سے اب تک
ترا فرمان تھا یہ اس پہ کوئی داغ نہ ہو
سو یہ بے عیب اچھوتا بھی تھا ان دیکھا بھی
بے کراں ریگ میں سب گرم ہو جذب ہوا
دیکھ چادر پہ مری شب ہے اُس کا دھبّا

(باکرہ)

فہمیدہ نے تخلیقی سفر ایک ایسے ماحول میں شروع کیا جس میں فضا ہموار نہ تھی۔ فضا میں درد، کرب اور گھٹن تھی۔ پھر بھی اس کثیف فضا میں بھی انہوں نے خواتین کی کمزوری کو غالب نہیں ہونے دیا بلکہ اس کو اپنی طاقت سمجھ کر اس کا استعمال کیا۔ ''ماگھ دوت''، ''ابد''، ''زبانوں کا بوسہ''، ''زن ناپاک''، ''اقلیما''، ''لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا''، ''چادر اور چار دیواری'' یہ سبھی ایسی نظمیں ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فہمیدہ نے عورت کی نئی بازیافت کی ہے کیونکہ ان نظموں میں مکمل عورت کے وجود کا ذکر ہوا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

زبانوں کے رس میں یہ کیسی مہک ہے
یہ بوسہ کی جس سے محبت کی صہبا کی اُڑتی ہے خوشبو
یہ بدمست خوشبو جو گہرا غنودہ نشہ لا رہی ہے
یہ کیسا نشہ ہے

لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا

چھو کے میرا بدن

اپنے بچے کے دل کا دھڑکنا سنو

ناف کے اس طرف

اس کی جنبش کو محسوس کرتے ہوئے تم

بس یہیں چھوڑ دو

تھوڑی دیر اور اس ہاتھ کو میرے ٹھنڈے بدن پر یہیں چھوڑ دو

میرے بیکل نفس کو قرار آ گیا

(لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا)

''دھوپ'' کی نظموں میں فہمیدہ ایک بھرپور عورت ظاہر ہوتی ہیں۔ ''دھوپ'' کی نظموں میں احتجاج اور بغاوت کے لہجے میں بھی نرمی اور سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ ''دھوپ'' کی اشاعت سے فہمیدہ کی شاعری کا ایک ایسا دور شروع ہوتا ہے جس کی نظموں کی لفظیات میں نئے تجربے شامل ہیں اور اس کے گیت بھی بہت خوبصورت ہیں۔ دھوپ کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

دیکھو ری موری جھولی میں چمکے لعل

دمکتی ایسی، جھلکتی جیسے، مورے آنچل میں

کرن چونچال

گلی میں کھڑی کھیلے، بلائیں دھرتی لے

پون لے جھک کے چنریا سنبھال

کوئل سی بولے، پتنگ سی ڈولے، پون سنگ ہولے

اڑاتی بال

چنک کر بولے، ہونٹوں پر روئے جلتر بھولے

مورنی چال

('دھوپ')

دھوپ کی نظموں اور گیتوں کی زبان کٹھن نہیں، پاکستان میں مروّج قومی زبان سے ذرا

مختلف ہے کیونکہ اس میں عربی فارسی کی جگہ ہندوستانی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

دوسری شاعرات کی طرح فہمیدہ کے یہاں بھی بغاوت کی لَے بہت تیز ہے۔ نظامِ حکومت اور اس سے وابستہ افراد نے جس سکھ اور چین کا خاتمہ کیا ہے اور ایک ایسے سماجی رویے کو فروغ دیا ہے جس میں ہر فرد پریشان ہے۔ ''شہر والو سنو'' فہمیدہ کی ایک ایسی بلند پایہ نظم ہے جس میں سیاسی اور سماجی فریب کاروں کے مضر اثرات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے لیکن نظم کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نظم استعاراتی اور بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس سے فہمیدہ کی فنی خصوصیات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

وہ عجب مملکت ہے
جانور جس پہ مدت سے حکمراں تھے
گو رعایا کو اس کا پتہ تک نہ تھا
اور تھا بھی تو بے بس تھے، لاچار تھے
ان میں جو اہلِ دانش تھے مدّت ہوئے مر چکے تھے
جو زندہ تھے بیمار تھے

(شہر والو سنو)

اس نظم کے مصرعے عوام کو نہ صرف برائیوں سے وصف کی طرف بلکہ ان میں بغاوت کی آگ بھی بھڑکانا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پر فہمیدہ ایک شاعرہ کے ساتھ ساتھ ایک خطیب کا رول بھی ادا کر رہی ہیں اور کسی حد تک ترقی پسند تحریک سے قریب بھی ہو گئی ہیں۔ اس نظم کے سلسلے میں ارشاد خالد رقمطراز ہیں:

''شہر والو سنو'' ہماری سیاسی، سماجی اور عمرانی صورتِ حال کی ایک فکر انگیز دستاویز ہے۔'' (اپنی نگاہ، ترتیب: جویریہ خالد، ثمینہ راجہ، ص:۶۹)

فہمیدہ خود اپنے شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' کے دیباچے میں فرماتی ہیں:

''دل! دشمن'' میں دیکھئے جس کی ابتداء ہے۔

''عاقلوں نے فرمایا''

''عاقلوں'' کے مشورہ کے بعد نظم میں اپنی ہار مان لینے کی کوشش کا ذکر تو ضرور ہے لیکن

نظم کا انجام یہی ہے کہ

ہونٹ بھینچ کر اپنے
روکتے ہیں جب آنسو
آنکھ میں کھٹکتے ہیں

مجموعہ ''اپنا جرم ثابت ہے'' کی نظموں کے عنوان سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ فہمیدہ صحت مند اقدار پر مشتمل نظام کی خواہاں ہیں۔ انہیں موجودہ نظام سے کوئی امید نہیں۔ ''کوتوال بیٹھا ہے''، ''سازش''، ''اے دیس مبارک ہو''، ''خانہ تلاش'' اور ''بدلی تیری چھاؤں'' اس پورے عہد کا ایک استعارہ ہے۔ ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'' غالباً یہ اردو ادب کا پہلا رزمیہ ہے جو نثری نظم میں لکھا گیا ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

میں چلی جا رہی ہوں
اردو کو دانتوں میں پیستی
سمیٹتی اپنے منتشر ہوتے وجود کو
جو بار بار بل کھا کر
میری پیشانی کی گرہ بن گیا ہے

(''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'' نثری نظم)

ایک نظم جس میں ریاستی اداروں کا تجزیہ ہے۔ ملاحظہ ہو

عدالتیں کسی بھی طرح کی ہوں
سرسری ہی ہوتی ہیں
میرے دیس میں

یہ رزمیہ بند پنجرے کے انہدام کی آس میں ختم ہوتا ہے۔

فہمیدہ کی شاعری پر خوبصورت تبصرہ شاہد حسن نے اپنے جامع اور مختصر مضمون میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں فہمیدہ ریاض کی آواز ایک ایسی آواز کی حیثیت سے یاد کی جائے گی جس نے اس حوصلے کو اپنایا جو کسی استحصالی نظام کے خنجر تلے

بریدہ ہوتے ہوئے گلے سے ایک چیخ کی مانند نکل پڑتا ہے۔فہمیدہ ریاض نے ''پتھر کی زبان'' سے ''بدن دریدہ'' کی شاعری تک آتے آتے عورت کے تجربات کی سچائیوں کو انتہائی بیباک اظہار سے مربوط کر کے اَن لکھے اور اَن کہے ممنوعہ جذبوں کے حوالے سے ایک ایسی فضا مرتب کردی جس میں عورت ایک سراپا احتجاج بن کر ابھری۔''

(اپنی نگاہ، ترتیب: جویریہ خالد، ثمینہ راجہ، ص:۱۹)

یہ احتجاج مرد کی جملہ حیثیتوں سے مغلوب اس روایتی معاشرے کے خلاف ہے جس میں عورت کے احساس اور جذبات کی خالصیت کو مذہب، سماج، قانون اور اخلاقی قدروں کے نام پر ہمیشہ جھٹلایا جاتا ہے اور یہی دوغلہ رویہ عورت کو ایسے وجود کے مکمل ادراک سے محروم رکھے ہوئے ہے۔

پروین شاکر کی شاعری میں فکری وفنی عناصر

اردو شاعری کو اوج کمال تک پہنچانے میں شعراء کے ساتھ شاعرات نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاعرات نے اپنے عہد میں ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور بڑی بیباکی کے ساتھ کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فکری اور فنّی لحاظ سے بھی انہوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق اپنے کو اس سانچے میں ڈھالا۔ اس عہد کی شاعرات نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ سماج میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہیں۔ اکثر شاعرات کے نام آتے ہی یہ بات ذہن نشین ہوجاتی ہے کہ وہ محض عورتوں کے مسائل کو پیش کریں گی مگر ایسا نہیں ہے۔ بیشتر شاعرات نے ہم عصر مسائل کو اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے۔ گویا شاعروں کی طرح شاعرات کی نظریں بھی اپنے عہد کی سماجی سیاسی اور تہذیبی حالات پر بہت گہری تھیں۔ جس کے اثرات ان کی شاعری میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔

جیسے جیسے دنیا روشن خیال ہوتی گئی لوگوں کے نظریے بدلتے گئے۔ اس رنگارنگی دنیا میں سبھی کو ذریعہ معاش کی فکر ہونے لگی۔ نئی تکنیک کی ایجاد سے لوگوں نے قدیم روایات کو ترک کیا اور جدیدیت کی طرف مائل ہوئے اور اپنے رویہ میں تبدیلی کی۔ فکر و خیالات کو ایک نئی راہ کی طرف گامزن کیا۔ اس طرح کی تبدیلی صرف مردوں میں نہیں ہوئی بلکہ عورتوں میں بھی ہوئی۔ عورتوں کو بھی اپنی حقیقت اور معیار کو پہچاننے کا موقع ملا۔ ان عورتوں نے معاشرہ میں رہ کر ہی شعروادب کے ذریعے اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کیا۔ شاعری اور دوسری صنفِ سخن (افسانہ، ناول، داستان) کے حوالے سے اپنے بیباکانہ طرزِ اظہار کو پیش کیا۔ شاعری کے ذریعہ نئے رجحانات وخیالات کی نمائندگی کرنے والی شاعرات میں ساجدہ زیدی، زہرہ نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے نام سرفہرست ہیں۔ ان خواتین شاعرات نے اپنی

آزادی اور حقوق کے لیے جدو جہد کی۔ ان کی اس کوشش نے شعری سطح پر ایک نئی جہت کو فروغ دیا۔ اپنے تہذیب و معاشرہ اور قدیم زمانے سے چلی آ رہی روایات کو ترک کر کے مغربی کلچر سے گمراہ ہونے والے سماج کو راہ پر لانے کے لیے ان شاعرات نے بڑے پیمانے پر آواز بلند کیں اور کافی حد تک کامیاب ہوئیں۔ ان شاعرات کی شاعری میں اکثر کے یہاں شاعرہ بولتی ہے تو عورت غائب ہو جاتی ہے اور عورت کی آواز سنائی دیتی ہے تو شاعرہ پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن پروین پہلی وہ خاتون شاعرہ ہیں جس کے یہاں عورت اور شاعرہ دونوں ایک ساتھ چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

پروین نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت کچھ خواتین شاعرات اپنی تخلیقی جلوے بکھیر چکی تھیں اور عوام میں مقبولِ عام تھیں۔ ایسے وقت میں پروین کے لیے قدم جمانا بہت ہی مشکل تھا۔ مگر پروین نے ان سب کے درمیان اپنی انفرادیت بنائی۔ انہوں نے اپنے اسلوب اور لب و لہجے کو مختلف طرز دی جس کی وجہ سے انہیں ہم عصر شاعرات میں منفرد سمجھا گیا۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

لڑکیاں بیٹھی ہیں پاؤں ڈال کے
روشنی ہونے لگی تالاب میں

پروین کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خوبصورت اور نازک خیالات کو شاعری کے ذریعے ادا کر کے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا اور اس میں نئی جہت کا اضافہ بھی کیا۔ کہتی ہیں کہ

وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

شاعری کے لیے فکر و جذبات میں توازن قائم رکھنا بیحد ضروری ہے۔ اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بیشتر شاعرات فکر سے زیادہ جذبات کو ترجیح دیتی ہیں۔ پروین کے کلام کا مطالعہ

کرتے ہیں تو ان کے یہاں بھی اسی طرح کے فکر وفن ملتے ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہاں مگر جذبات کی شدت، اسلوب بیان کا نیا انداز انہیں اوروں سے مختلف کرتا ہے اور یہی اندازِ بیان قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ہجر، وصال، صبح وشام، جنسی خواہشات، بے وفائی کے کرب، شک وشبہات جیسی باتیں زیادہ تر شاعرات کے یہاں مل جاتی ہیں۔ مرد کا وجود ہی عورت کی اپنی ذات کا وہ خاص اور اٹوٹ حصہ ہے جس کے بغیر عورت ایک قدم بھی نہیں چلتی عورت اپنی خواہشات اور دوسرے سبھی رشتوں کی وضاحت اسی سیاق میں کرتی ہیں۔ عورتوں کے نزدیک مرد کی ذات ستم گر اور بے وفا سے زیادہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروین کا شعری تجربہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ مرد کے بغیر ایک قدم بھی چلنا ان کے لیے مشکل ہے۔ خواہ وہ مرد ان کا محبوب ہو یا شوہر یا پھر سر پرست۔

پروین نے احمد ندیم قاسمی کو اپنی شاعری میں ''مہرباں بادل'' یعنی سر پرست کہا ہے۔ ان کی موجودگی پروین کی زندگی میں کیا مقام رکھتی تھی اس کا اندازہ ان کے ان چند اشعار سے واضح ہوجاتا ہے۔

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

وہ مہرباں سایہ دار بادل
عذاب کی رُت میں چھوڑ کر مجھ کو جا چکا تھا

دور رہ کر بھی سدا رہتی تھی
مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اس کی

اردو ادب میں سچے نسائی محسوسات اور جذبات کی شاعری بہت کم ہوئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعرات نے آنکھیں بند کر کے اردو زبان اور شاعری کے مروجہ آہنگ کو اپنا لیا۔ غزل اور نسائیت سے متعلق پروین کے بارے میں ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اقتباس 'اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک' کتاب سے ماخوذ ہے:

''غزل کی دنیا میں پروین شاکر ایک عہد آفریں شاعرہ بن کر آئیں اور اپنی

نسائی آواز، چونکا دینے والے اسلوب سے اردو شاعرات میں ہلچل مچا دی۔ پروین شاکر کی شاعری میں صنف نازک کی بے چارگی اور بے بسی کا ایسا درد بھرا ہوا ہے جو اس ہرنی کے انداز سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو چاروں طرف سے شکاریوں سے گھر چکی اور بے چارگی اور بے بسی سے نتھنے کو رگڑ رہی ہو۔ چونکہ غزالہ کے معنی ہرنی ہوتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں اس صنف سخن کو غزل کہا جانے لگا۔''

(اردو شاعری میرؔ سے پروین شاکر تک مضمون 'پروین شاکر' از: قاضی مشتاق احمد)

خلیق الزماں نصرت نے لکھا ہے کہ:

''پروین شاکر کی غزلوں میں نسوانیت کی وہ چیخ چھپی ہوئی ہے جو ایک غیر مطمئن روح سے اُبھری ہے، جو ایک طرف شاخِ گل ہے تو دوسری طرف تلوار بھی ہے۔ انسانی سماج کی ایک عام عورت جو رشتوں میں بندھی ہوئی ہے۔ ایک ایسی شاخِ گل ہے جس پر مرجھائے ہوئے باسی پھول ٹنگے ہوئے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی ناخوشی اور عدم توازن کے سبب ان غزلوں میں نسوانی جذبات کی حقیقی عکاسی تو ملتی ہے۔ لیکن ایسی عکاسی جو ایک بااختیار صاحب وسیلہ نسائیت کا عکس ہو، اس کے عہدے پر فائز ایک ایسی بااختیار تلوار کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے جس میں رزمیے کی نہیں مرثیے کی لے پائی جاتی ہے۔ جنس کی ناآسودہ تڑپ کا اظہار پایا جاتا ہے۔''

(کتاب اردو شاعری میرؔ سے پروین شاکر تک مضمون 'پروین شاکر' قاضی مشتاق احمد)

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائباں چھوڑ گیا

انگلیوں کو تراش دیں پھر بھی
عادتاً اُس کا نام لکھیں گی

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اس کے گھر کا دروازہ ہوا

ہ کیا کہ وہ جب چاہے، مجھے چھین لے مجھ سے
اپنے لیے وہ شخص تڑپتا بھی تو دیکھوں

پروین کی شاعری جذبات سے بھری ہے اور ایک چار و ناچار لڑکی کے احساسات و جذبات کی عکاس ہے۔ وہ حوصلہ مند بھی ہے اور اپنے اطراف سے باخبر بھی۔ ''خوشبو'' سے ''انکار'' تک کا سفر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی خط کو پورا کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

ہماری شاعرات پر نسائیت کے چاہے جتنے گہرے اثرات کیوں نہ ہوں مگر یہ شاعرات ان احساسات سے باہر نہیں نکل سکیں جس سے مقابلہ کے بجائے سپردگی ملتی ہے جو آج بھی کہیں نہ کہیں نظر آتی ہے۔ نسائی احساسات خواتین فنکار کے ذہن و دل میں پنہاں ہیں کہ وہ کمزور اور دوسروں کی محتاج ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جس دن ان خیالات کو دل سے نکال دیں گی اس دن سے نسائی شاعری کا انداز بیان اور رنگ و روپ جدا ہو جائے گا۔ ایسے ہی احساسات ہم پروین کی شاعری کے اوائلی دور میں دیکھتے ہیں مگر جب دن گزرتا ہے وہ عشق و محبت کے رنگ میں جذب ہوتی جاتی ہے اور ان کے جذبات کا رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے لیکن یہ رنگ ابھی پورا چڑھا نہیں تھا کہ ایک اندیشہ، ایک بے چینی، ایک کرب، ایک ہجر انہیں اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور پھر شکست و ریخت کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی پروین کی شاعری کا

بنیادی محرک ہے جس سے ان کی شاعری کو ایک نئی زندگی ملتی ہے۔ پروین نے اپنی اہمیت و جرأت اور صلاحیت کے ذریعے ہر لحہ آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ یہی کوشش ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کرتی ہے۔ فاروق علی کے الفاظ ہیں کہ:

> ''خوشبو کے سفر، صد برگ ہاتھ میں لیے خواہشوں کے ہفت خواں سے گزرتی آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کا سفر نہ تھکا دینے والا ہے اور نہ بے مقصد۔ اس کی شاعری میں چھوٹے چھوٹے الیاتی لمحے قرینے سے چنے نظر آتے ہیں۔ نظم اور غزل دونوں میں وہ متوازی قطاروں کے دروں پر ہلکی ہلکی دستکیں دیتی بڑھ رہی ہیں۔''
>
> (پاکستانی شاعرات، فاروق علی، ص:۶۹۷)

اس سلسلے میں معین الدین عقیل کا خیال ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''پروین شاکر نے اپنے پہلے شعری مجموعے میں اپنی جن صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا وہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''صد برگ'' میں اس سطح پر نظر نہیں آتیں۔ خیالات و جذبات میں تازگی اور نکھار تو ہے لیکن اب اس میں ندرت اور دلکشی کی کیفیت کم ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ''خوشبو'' کے مقابلے میں ان کی شاعری ''صد برگ'' میں زوال پذیر ہوئی ہے۔'' (پاکستان میں اردو غزل، معین الدین عقیل، ص:۷۱)

معین الدین کے اس اقتباس پر بحث کی گنجائش ہے کیونکہ ''خوشبو'' میں پروین کی شاعری کے موضوعات ایک خاص دائرے میں ہیں۔ عشق و محبت کے موضوعات ویسے ہی نازک ہوتے ہیں۔ بیان کی تازگی اور ندرت سے ان موضوعات سے تاثر پذیری کی طاقت بھی زیادہ ہوتی ہے جب کہ ''صد برگ'' کا موضوع ''خوشبو'' سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں انہوں نے زندگی کی سفاکیوں بے مروت اور بے رحم سچائیوں کو پیش کیا ہے۔ ''خوشبو'' کی ذات سے نکل کر ''صد برگ'' میں معاشرے کی حقیقت کو ایک فرد کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے میں پروین کے مجموعہ ''صد برگ'' کی چند سطریں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں:

''صد برگ تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا میری زندگی کا بھی اور اس سرزمین کا بھی۔ جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے۔''

''رزقِ ہوا'' میں پروین شاکر نے لکھا ہے:

''لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری، دینارِ عزت نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں تو سماعتیں، بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں۔'' (مجموعہ 'صد برگ'، 'رزق ہوا'..... پروین شاکر، ص:۱۳)

پروین کی شاعری کے وسیلے سے ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں پہلی بار نہ سہی دوسری یا پھر تیسری چوتھی بار ہی سہی عورت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جسم و جان کی مختلف کیفیات سے بھرپور اس عورت کی آواز ہے جو صدیوں سے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی جبر و استحصال کا شکار ہوتی رہی ہے۔ اس عورت نے اپنے ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ ساتھ اپنی روح پر لپٹی ہوئی زنجیر کو توڑنے اور خود کو ساری پابندیوں سے آزاد کرنے کی قسم کھائی تھی۔

پروین مکمل طور پر نسائی جذبات کی شاعرہ ہیں۔ ان کے خیال سے عورت کا وجود ایک مکمل حیثیت کا مالک ہے۔ ان کی نظر میں جب عورت ہونا شرم کی بات نہیں تو پھر عورت کی سوچوں کو اجاگر کرنا بھی شرم کی بات نہیں ہوسکتی۔ مردوں کے لیے ہر وہ چیز روا ہے جسے عورتوں کے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دیا گیا۔ اس طرح کے رویے نے وجودِ کائنات سے ازلی حیثیت اختیار کرلی ہے جس کی وجہ سے اس کے خیال میں پختگی آگئی کہ عورت کے جسم کو صرف قبول کرنا اور ان کی جان کو رد کردینا مردوں کی عام روش ہے۔ اس عام روش کے خلاف آواز بلند کردی ہے۔

جب عورت اور مرد کو یکساں سمجھا گیا تو پھر عورت کے محسوسات کا اظہار جرم کیوں؟ ہوسکتا ہے پروین کا یہ جرأت مندانہ قدم اس کے باغی ہونے کی نشاندہی کرتا ہو۔ پھر بھی اس طرح کی ذہنیت بدلے ہوئے دور کے بدلے ہوئے مزاج کی عورت کی آئینہ دار ہے۔ پروین کی یہ آواز صدیوں سے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی جبر و استحصال کا شکار ہوتی ہوئی عورتوں کی آواز ہے۔

پروین اپنی شاعری میں اس عورت کی نمائندگی کررہی ہیں جو مرد کے ساتھ برابری کے رشتے کی خواہاں ہے۔ خواہ وہ رشتہ جسم و جان کا ہو، محبت و نفرت کا ہو یا پھر کسی بھی نوعیت کا ہو۔

یہ وہ عورت ہے جو احساسِ کمتری کا شکار ہونا نہیں چاہتی اور نہ مرد کے مقابلے میں برتری کا جذبہ رکھتی ہے۔ پروین کے یہاں برابری کا رشتہ دیکھا جا سکتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔

میں کیوں اس کو فون کروں
اس کے بھی علم میں ہوگا
کل شب موسم کی پہلی
بارش تھی

پروین کی شاعری میں ہندی شاعری کے اثرات بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔''بارہ ماسہ'' میں جس طرح ایک غم فراق میں ستائی ہوئی عورت کی طرف سے موسمی کیفیات کی مصوری اور جذبات نگاری کی جاتی ہے اسی طرح ہم پروین کے یہاں بھی دیکھ سکتے ہیں۔''بارہ ماسہ'' میں سال کے پورے مہینے کی جدائی اور منظر بیان کیے جاتے ہیں مگر پروین کے یہاں صرف اس کے ایک حصہ یعنی برسات میں ہونے والی کیفیات کو موضوع بنایا گیا ہے جسے ہم ان چند اشعار سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

نم ہیں پلکیں تری اے موجِ ہوا، رات کے ساتھ
کیا تجھے بھی کوئی یاد آتا ہے برسات کے ساتھ

پروین کے یہاں تخیل کے ہمراہ تاثر بھی ہے۔ ان کے محرکات باغیانہ سہی، ان کے خیالات آزاد ہیں۔ ان کے یہاں نہ سب کچھ قدیم ہے نہ جدید۔ اگر ان کی شاعری عصری موضوعات کو چھوتی ہے تو عہد حاضر کی بازگشت بھی پیش کرتی ہے۔ ان کی ایک نظر شجر ثمر بار کی اونچائیوں پر ہے تو دوسری نظر شجر کی مٹی میں پیوست جڑوں کی گہرائیوں پر بھی ہے۔ تبھی تو کہتی ہیں کہ

میں برگ برگ اس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا

پروین اپنی ذات اور خود بینی سے جب کشمکش میں پڑتی ہیں تو ان کی حالت یوں شعر میں تبدیل ہوتی ہے۔ کہتی ہیں کہ

تجھے سناؤں کہ اپنی انا سے بات کروں
الجھ رہا ہے میرا فیصلوں کا ریشم پھر

وہ طلب عشق کو مقدم سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ عشق میں ذہن کی نہیں بلکہ دل کی حکمرانی ہوتی ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

عشق و عاشقی، لب و رخسار اور ہجر و وصال کی شاعری تو بیشتر شاعروں نے کی ہے اور اس طرح کی شاعری میں زیادہ تر مردوں کے ہی دکھ درد کی داستان بیان ہوئی ہے۔ اگر ہم ہندی شاعری کو دیکھیں تو اس میں عورت عاشق ضرور ہے مگر شاعری کے مالک اکثر مرد ہی رہے ہیں۔ لہٰذا عشقیہ شاعری مردوں کی جائیداد بن کر رہ گئی۔ کسی زمانے میں ایک اردو شاعر نے تو عشق کی بات کے بارے میں عورتوں کی زبانی یہاں تک کہا تھا کہ "ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔"

پروین کی یہ نظم ملاحظہ ہو۔

گِلہ کیسا

اسیرِ شامِ تنہائی سے یہ آخر گلہ کیسا
تجھے تو علم تھا زنجیر کا میری
جو پیروں میں بھی ہے
اور روح پر بھی

میں اپنے بخت کی قیدی ہوں
میری زندگی میں
نرم آوازوں کے جگنو کم چمکتے ہیں
فصیلِ شہرِ غم پر خوش صدا طائر
کہاں آ کر ٹھہرتے ہیں
تری آواز کا ریشم میں کیسے کاٹ سکتی تھی
مرے بس میں اگر ہوتا
تو ساری عمر
اس ریشم سے اپنے خواب بنتی
اور اس رِم جھم کے اندر بھیگتی رہتی!
تجھے تو میرے دکھ معلوم تھے جاناں
یہ کس لہجے میں تو رخصت ہوا ہے!

(مجموعہ 'کفِ آئینہ'، پروین شاکر، ص:۴۶)

پروین کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ ان کی بیشتر غزلیں مقطع سے محروم ہیں۔ یہ ان کے مزاج کی انفرادیت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قافیوں کے استعمال میں پوری آزادی سے کام لیا ہے اور روایت سے بغاوت کرتے ہوئے فنّی و لسانی ضابطوں کی پابندی پر اپنے خیالات کو بڑے ہی آزادانہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اُداس کتنا تھا
وہ جس کو بزم میں مہمان عام بھی نہ کہا
کسے بتائیں کہ خلوت میں خاص کتنا تھا

پھر خیمے جلے ہیں اور سرِ شام
بین ہے اپنے وارث کا

پروین اپنے عہد کی باکمال اور نمائندہ شاعرات میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں غزل اور نظم دونوں اصناف میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق وہ نظم میں زیادہ نکھری نکھری لگتی ہیں۔ اس صنف میں انہوں نے اپنے تیکھے اور طنزیہ انداز سے ایک منفرد اور نمایاں کردار پیش کیا ہے۔ طنز سے بھرپور ایک نظم "فَبِایِّ الاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن" ملاحظہ ہو۔

دلآزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے اُن کا بُرج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پہلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی ملتے رہتے ہیں
مالاباری کیبن ہوں یا پانچ ستارہ ہوٹل
کہیں بھی قے کرنے سے باز نہیں آتے
اوپر سے اس عمل کو
فقرے بازی کہتے ہیں
جس کا پہلا نشانہ عموماً
بل کو ادا کرنے والا ساتھی ہوتا ہے!

(نظم: "فَبِایِّ الاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن" خودکلامی، ص: ۱۰۸)

طنز پروین کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ جس کی جھلک ان کی نظم اور غزل دونوں ہی میں کامیابی کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے جیسے

میں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

آستین سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہلِ کوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

اگر ہم پروین کی پوری شاعری کا مطالعہ کریں تو یہ دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اوّل وہ جس میں عشق و محبت کا شدید جذبہ اور بے قراری کارفرما ہے۔ اس حصہ میں جنسی خواہشات اپنے شباب پر ہے۔ دوئم وہ جس میں موت، زندگی سے فرار، ہجر و وصال اور نفرت کے ساتھ ساتھ تنہائی کا احساس نمایاں ہے۔ یہ دونوں حصے نفسیاتی کیفیت کے مدِ نظر مختلف ہیں۔ پروین نے ان جنسی خواہشات کو بڑی برجستگی اور بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے جو انسان کے اندر ہی اندر شرم اور گھٹن پیدا کرتے ہیں۔ اشارے کے علاوہ پروین نے کھلے پن کا اظہار جہاں جہاں کیا ہے وہاں وہاں خیالات سطحی اور فحش تو ضرور ہو گئے ہیں مگر سچائی سے پرے نہیں۔ چند اشعار دیکھیے

رگ رگ میں اس کا لمس اُترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

وہ آگ ہے کہ مری پور پور جلتی ہے
مرے بدن کو ملا ہے چنار کا موسم

میں اِس وصال کے لمحے کا نام کیا رکھوں
ترے لباس کی شکنیں تری جبیں سے ملیں

پروین نے اپنی شاعری میں پیکر تراشی کے نئے عوامل کی جانب بے حد توجہ دی ہے۔ انہوں نے الفاظ اور علائم کے نئے نئے راستے نکالے۔ وہ جدید تشبیہات و علامات اور لفظی و معنوی تشکیلات کو برتتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ یہ نسائی شخصیت، مزاج، فطرت اور جذبات و احساسات کی تخلیقی ترسیل میں ایک خاص اہمیت پا سکے۔

مرے ماتھے پہ ترے پیار کا ہاتھ
روح پر دست صبا ہو جیسے

شبنم کے رخساروں پر سورج کے ہونٹ
ٹھہر گیا ہے وصل کا ایک روشن لمحہ

تجھ کو خواہش تھی کہ گہری رات کا تارہ بنے
آ، کہ اب پہلے سے بھی تاریک ہیں گیسو کے گھر

جسم کے تیرہ و آسیب زدہ مندر میں
دل سرِ شام سلگ اٹھتا ہے صندل کی طرح

پروین کے یہاں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو عروج تک پہنچانے کے لیے عام فہم لفظوں کا استعمال کیا۔ یہی ان کے کلام کی امتیازی خوبی ہے۔

کھلی آنکھوں میں سپنا جھانکتا ہے
وہ سویا ہے کہ کچھ کچھ جاگتا ہے
تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن، مور بن کر ناچتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
کسی کے دھیان میں ڈوبا ہوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

(مجموعہ 'خوشبو'، ص: ۸۵)

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
مرے بستر کی ہر شکن کی طرح

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

اس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا، لوگو

اپنی رسوائی ترے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

شاعری کے میدان میں اگرچہ بعض بہت معیاری شاعرات منظرِ عام پہ آئیں لیکن اپنے پاؤں نہ جما سکیں۔ اس کے برخلاف پروین کا کلام اپنی نوعیت، طرزِ ادا، الفاظ کی ہم آہنگی اور فکر و شعور کے ساتھ ساتھ پیچیدگی کے اعتبار سے بھی دوسری تمام شاعرات سے اپنے آپ کو منفرد بناتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات کو بڑی خوبی اور سچائی کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے پیش کرنے کی یہ صلاحیت اور صداقت اتنی مختلف ہے کہ قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔ اس شعر میں پروین کے ذاتی کرب کو دیکھا جاسکتا ہے۔

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے
پر مری جان! ملے مجھ کو سزا آہستہ

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کم وبیش تمام شاعرات فکر سے زیادہ جذبات پر بھروسہ کرتی ہیں اوران کی شاعری میں بھی یہی جذبات سامنے آتے ہیں۔ حالانکہ فکر و جذبات میں توازن قائم رکھنا بے حد ضروری ہے۔ جب ہم پروین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی شاعری میں بھی وہی سب کچھ ملتا ہے جو ہماری دوسری شاعرات کے یہاں موجود ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی تھوڑا سا ہی اختلاف نظر آتا ہے۔ جو انہیں دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ وہ ان کے جذبات کی شدت کی تیز لہر اور اسلوب بیان کا نیا پن ہے۔

پروین اپنے محبوب کے لیے اپنی چاہت اور لطف وکرم کے ذکر سے بھی دست کش نہیں ہوتیں۔ چند اشعار دیکھئے

رہے وہ زلف کے بادل کے سائبان رہے
سفر کی دھوپ بہت تیز ہے دھیان رہے

سکوتِ شہرِ سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب کردے گا

سفر میں چاند کا ماتھا جہاں میں دُھندلایا
تری نگاہ کی زیبائی نے قیادت کی!

اپنے محبت کی راہوں کے غمناک، پُرخار اور پُرخطر ہونے سے وہ بے خبر ہیں مانو کچھ پتہ ہی نہیں۔ اس ضمن کے چند اشعار

سورج کے ساتھ ڈوب گیا میرا دل بھی آج
اتنا اُداس شام کا منظر کبھی نہ تھا
مری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے رِدائی کو مری دے گیا تشہیر کون

پروین کے کلام میں رات کی رانی کی مہک تو ہے لیکن گلِ عباس کا پھیکا پن بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں کانٹوں کی درد چبھن، نسائیت کا بانکپن، جنسی مشاہدے اور کڑوے پن کا احساس ہوتا ہے۔ عشقیہ جذبات میں بیباکی، رنگ آمیزی اور بے حجابی کا عکس بڑے ہی

مختلف انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

جی یہ چاہے پھر توڑ کے رکھ دے مجھ کو
لذتیں ایسی کہاں ہیں تھکن میں اب کے

نظیر صدیقی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر کا موازنہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

> ''پروین شاکر کی شاعری لڑکی کی ترجمان ہے۔ کشور ناہید کی شاعری عورت کی اور فہمیدہ ریاض کی شاعری جدید عورت کی۔ ان تینوں میں جہاں تک شعری تکمیل کا تعلق ہے۔ پروین شاکر اپنی ہم عصر شاعرات پر فوقیت لے گئی ہیں۔'' ('دورِ حاضر کی نمائندہ پاکستانی شاعرات' ایم جمال علوی، ص:۲۱)

پروین کی ابتدائی شاعری ''لڑکی'' کی ترجمان ہے۔ اس حقیقت کی نشاندہی ان کے پہلے شعری مجموعہ ''خوشبو'' سے ہوتا ہے جو عورت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ لڑکی بتدریج ارتقا عورت بنا ہے۔ ہم دیکھیں تو پروین شاکر کی غزلوں کا کینوس بہت بڑا نہیں ہے لیکن اس چھوٹے سے کینوس میں انہوں نے مختلف رنگوں سے ایسا نقش اُبھارا ہے جس سے نظر ہٹانے کا جی نہیں چاہتا۔

پروین کی غزلیہ شاعری کی کائنات کا اہم ترین استعارہ خوشبو ہے۔ خوشبو ان کو بہت پسند تھی۔ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ کا نام بھی ''خوشبو'' رکھا۔ خوشبو کا یہ استعارہ محبوب کی چاہت بھی ہے اور نسائی وجود کی نرمی و مخالفت اور حسن و نزاکت بھی۔ خوشبو کو ہم دوشیزہ کے احساسات و جذبات کی کیفیات سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور کہیں پر اس کو مخصوص کیفیات کے اظہار کے لیے استعارہ کے روپ میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سراغ ہے

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

پروین کے یہاں روحوں کے ملن سے زیادہ جسموں کے ملن کو اہمیت حاصل ہے۔ جنسی خواہشات کو شعری پیکر میں ڈھال دینا حقیقت کا اظہار تو ہوسکتا ہے مگر فن کی معراج کو نہیں پاسکتا۔ نفسیاتی کمزوریوں کے بے باکانہ اظہار سے نہ تو فن کو کامیابی مل سکتی ہے اور نہ ادب کو۔ انہوں نے نفسیاتی خواہشوں کے اظہار میں اکثر اشاروں اور کنایوں کا سہارا بھی لیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی دبی ہوئی اور گھٹن محسوس کرتی ہوئی آوازیں سچائی کو بیان کرنے کے لیے خاموش نہیں رہتیں۔

وہ سمندر ہے تو پھر روح کو شاداب کرے
تشنگی کیوں مجھے دیتا ہے سرابوں کی طرح

انگلیوں کا لمس تھا اور میری زلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

ہونٹوں کا بے بات ہنسنا، زلفوں کا بے وجہ کھلنا، خوابوں کا غالب آنا، خوشبو کا لہرا جانا، شرمیلی مسکراہٹ یہ تمام کیفیات یونہی تو نہیں۔ پروین کے یہاں اپنی ذات کا یہ انکشاف ہے کہ ان کے اندر کی لڑکی خود کا اظہار کرے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی ایسا نام اس کی زندگی میں شامل نہ ہو جائے جو اس کی آنکھوں میں تارا بن کر چمکتا رہے۔

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھلی

خواب دکھا کے مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سنی
اور پھر جان گئی
میری آنکھوں میں ترے نام کا تارا چمکا!

(نظم کشف 'خوشبو' مجموعہ، ص: ۳۰)

پروین کے یہاں تجربات گونا گوں اور انھوں نے اظہارِ بیان میں ایک نئے اور منفرد انداز کو اہمیت دیتی ہیں جس کی وجہ سے پروین ایک مختلف شاعرہ بن اپنا لوہا منوایا۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر عشق کے جذبات و تجربات کی شاعری ہے جو اردو کی شاعری میں ایک نہایت خوبصورت اور منفرد اضافہ ہے۔ عشقیہ شاعری میں میرؔ اور پروین کی کامیابی کے درجے بلند ہیں لیکن دونوں کو جس حد تک کامیابی ملی اس کی سب سے بڑی خوبی عشق کی غیر معمولی صلاحیت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پروین شاعری اور عورت سے متعلق ایک جگہ لکھتی ہیں:

"شاعری اپنے ماحول اور زمین سے پھوٹتی ہے۔ ہمارے یہاں میراؔجی کی روایت تو تھی، جہاں عورت شعر کہتی ہے اور اسے اپنے عورت ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے اور وہ اپنے محبوب کی شخصیت، اس کے لباس، اس کے مزاج، اس کے طور طریقے سبھی کچھ شعر میں بیان کرتی ہے۔ یہ بات آپ کو دکنی شاعری میں بھی ملے گی۔"

(سہ ماہی 'اسباق'، شمارہ: فروری تا ستمبر ۹۵، عبدالاحد ساز، ص: ۵۱)

پروین کا مقابلہ ان کی ہم عصر شاعرات سے کرنا ان کے حق میں مناسب نہیں کیونکہ انھوں نے ایک منفرد لہجہ اور خیالات کے مدِ نظر اپنی شاعری کو فروغ دیا۔ دوسری شاعرات کے یہاں یہ انداز بیان نہ کے برابر ہے بلکہ وہ ایک روایتی شاعری تک ہی محدود رہ جاتی ہیں۔ پروین کی نئی غزلوں میں ایک الگ رنگ ابھرتا ہوا ملتا ہے۔

گھر کا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہم سفر ہونے کو ہے

جینے کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کردیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کردیا

پروین کو اپنا ماضی بہت عزیز ہے۔ وہ آج کے اس عہد میں جینے کے باوجود گزرے ہوئے کل کے موسموں کو یاد کرتے ہوئے اس دنیا میں کھو جاتی ہیں۔ جہاں ان کا محبوب ان کو زندگی کے حسین خواب کی سیر کراتا ہے۔ پروین کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اُس کا آج بیتے ہوئے کل کے مقابلے میں تکلیف دہ اور گھٹن سے بھرا ہوا ہے۔ اس پریشانی کو وہ اپنے لیے زندگی کا معمول اور سہارا بنالیتی ہیں۔ اُن کو اِس بات پر دُکھ نہیں کہ وہ ماضی میں کھو کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہیں۔ بلکہ دُکھ اس بات کا ہے کہ اُن کا وہ دوست جو شاہراہ زیست پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ چلا ہے وہ آج کسی اور کی طرف متوجہ ہے، عاشق ہے اور اس کے رخسار تھپتھپا رہا ہے۔ اس کے لیے ایک ایسی داستان پارینہ بن گئی ہیں جس کو بھول جانا بہتر ہوگا۔ ان کی ایک نظم ''آنے والی کل کا دکھ'' میں اس طرح کے خیالات و رجحانات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

تم اس کے رخسار تھپتھپا کے
کہو گے اس سے
''میں ایک لڑکی کو سوچتا تھا
عجیب لڑکی تھی— کتنی پاگل!''
تمہاری ساتھی کی خوبصورت جبیں پہ کوئی شکن بنے گی
تو تم بڑے پیار سے ہنسو گے
کہو گے اس سے
''ارے وہ لڑکی
وہ میرے جذبات کی حماقت

وہ اس قدر بے وقوف لڑکی
مرے لیے کب کی مر چکی ہے!"

پھر اپنی ساتھی کی نرم زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تم
کھو گے اس سے
چلو، نئے آنے والی کل میں
ہم اپنے ماضی کو دفن کر دیں

(مجموعہ 'خوشبو' نظم 'آنے والی کل کا دکھ'، ص: ۷۰-۷۱)

پروین کی شاعری میں سیاسی موضوعات پر بھی اشارے ملتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی شاعری میں تیکھا پن کے ساتھ ساتھ طنز بھی پایا جاتا ہے اور ارباب اقتدار کی ظالمانہ حرکات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اب اس جدید معاشرے میں زندگی کا معیار بدل چکا ہے۔ تہذیبی قدروں کے نمبر منسوخ کیے جا چکے ہیں۔ اس دور کا انسان نظام کے نابرابری اور ناپاک رویہ سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس کے خلاف پروین کی شاعری میں احتجاجی آہنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ اس کے ان کی غزلوں میں ماں کی ممتا اور اڈتا ہوا پیار بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں قاتل کا سر بلند ہو جائے انصاف کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی بے راہ روی اور احتجاج کے خلاف پروین کے یہاں بغاوت واحتجاج کی آواز بلند ہے۔

لہو جمنے سے پہلے خوں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھا دے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

تین رُتوں تک ماں جس کا رستہ دیکھے
وہ بچہ چوتھے موسم میں کھو جائے

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو میری پھر دے گیا تشہیر کون

پروین کی دوسری نظموں میں بھی اس طرح کے نظریات کی ترجمانی ملتی ہے اور اپنے حقوق کے لیے احتجاج ملتے ہیں۔ ارباب اقتدار کو یہ آگاہی ہے کہ انسان ابھی زندہ ہے اس کے احساسات ابھی بیدار ہیں۔ دنیا میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کی رگوں میں انسانیت اور وفا کا خون رواں ہے۔ جو ظلم و استحصال کو برداشت نہیں کر سکتے اس کے خلاف آواز اٹھانا فرض سمجھتے ہیں، بھلے ہی اس کا انجام ان کے لیے برا ہی کیوں نہ ہو۔

مگر مرے شہرِ منحرف میں
ابھی کچھ ایسے غیور و صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غلام زادے
انہیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سر اٹھانے سے میں چننے دینا

(نظم، تعزیہ، صد برگ، ص: ۱۳۶)

جن نظموں میں پروین نے خود ماں بن کر کچھ خطاب کیا ہے وہ نظمیں کافی پُراثر ہیں۔ اس اثر سے ایسی کیفیت دل و دماغ میں گھر کر جاتی ہے کہ مادرانہ پیار اپنی معراج ہے۔ اس طرح کی نظموں میں ماں کی ممتا اس جدید عورت کی ہے جو مجبور نہیں بلکہ عزم و محبت کا جذبہ رکھتی ہے۔ ان کی نظمیں ''شرارت بھری آنکھیں'' اور ''سفر اب جتنا باقی ہے'' میں ماں کی محبت اور سچائی کو بیان کیا گیا ہے۔ ماں تو بس ماں ہے جو لاکھ مصیبت کے باوجود بھی اپنی اولاد کے حق میں برا نہیں سوچتی اس گمان کو برداشت نہیں کر پاتی کہ اس کا لال ایک دن اسے تنہائی سونپ کر جدا ہو جائے گا۔

مرے گھر میں اجالا بھر گیا
تیری ہنسی کا

یہ ننھے ہاتھ جو گھر کی کوئی شے

اب کسی ترتیب میں رہنے نہیں دیتے

کوئی سامانِ آرائش نہیں اپنی جگہ پر اب

کوئی کیاری سلامت ہے

نہ کوئی پھول باقی

یہ مٹی میں سنے پاؤں

جو میری خواب گہہ کی دودھیا چادر کا ایسا حال کرتے ہیں

کہ کچھ لمحے گزرنے پر ہی پہچانی نہیں جاتی

مگر میری جبیں پر بل نہیں آتا

(نظم: شرارت سے بھری آنکھیں مجموعہ 'انکار' ص: ۳۷)

ماں اور بیٹے کی جدائی کے حوالے سے ان کی نظم ''سفراب جتنا باقی ہے...'' کا ایک ٹکڑا۔ غور فرمائیں۔

زیادہ دن نہ گزریں گے

مرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت

تجھے، کافی نہیں ہوگی

کوئی خوش لمس دستِ یاسمیں آ کر

گلابی رنگ حدت

تیرے ہاتھوں میں سمو دے گا

مرا دل تجھ کو کھو دے گا

میں باقی عمر

تیرا راستہ تکتی رہوں گی

میں ماں ہوں

اور مری قسمت جدائی ہے!

(نظم: 'سفراب جتنا باقی ہے...' مجموعہ 'انکار'، ص: ۴۱)

ایک نظم میں اپنے بیٹے کو نصیحت دیتی ہوئی کچھ اس انداز میں کہتی ہیں۔

مگر میں ماں ہوں

اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے

تو دنیا ختم ہو جائے

سویرے خوش گماں بچے!

تو اپنی لوحِ آئندہ پہ

سارے خوبصورت لفظ لکھنا

صدا سچ بولنا

احسان کرنا

پیار بھی کرنا

مگر آنکھیں کھُلی رکھنا!

(نظم: 'اپنے بیٹے کے لیے ایک نظم' مجموعہ 'انکار'، ص: ۴۴)

پروین نے جنسی موضوعات پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں اکثر ایک حسن لطیف سی کیفیت اپنا جمال دکھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ محبوب کی عدم موجودگی کے باوجود خود سے جنسی خواہش پیدا کرنے اور اس کی تکمیل میں کوشاں ہیں۔ ایسے موضوعات پر لہجے کی بیباکی بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ نظم "جدائی کے بندی خانہ میں..." کی شدت اور تڑپ سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے اندر جنسی تڑپ کتنی ہے۔

جدائی بندی خانے میں بند

برف کی سِل پہ تنہا بیٹھی

حرارتِ زندگی سے کچھ ربط ڈھونڈتی ہوں

بدن کو اپنے

تمہارے ہاتھوں سے چھو رہی ہوں!

(نظم: 'جدائی کے بندی خانے میں...' مجموعہ 'خود کلامی' ص: ۱۵۵)

پروین کی شاعری میں مشکیزہ، پانی، نیزہ، سورج، پیاس، کوفہ عشق، اور خیمہ جیسی تلمیحات

موجود ہیں جو ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع کرتی ہیں۔ یہ تلمیحات وتشبیہات ان کے کلام میں جہد زندگی کی علامت بن کر ابھری ہیں۔ پروین کی ہم عصر شاعرات کے یہاں بھی اس طرح کی تلمیحات وتشبیہات ملتی ہیں مگر پروین کہیں زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جس گھرانے میں جنم لیا وہ مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانہ تھا۔ اثنا عشری فرقہ سے نسبت ہونے کی وجہ سے ان کے گھر میں ہمیشہ میر انیس کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اس کا گہرا اثر ان کی شاعری پر پڑا۔ ان کا آخری شعری مجموعہ ”کفِ آئینہ“ کی شاعری کربلا اور اس کے واقعات کی یاد دلاتی ہے۔

روز اک دوست کے مرنے کی خبر آتی ہے
روز اک قتل پہ جس طرح کہ مامور ہے رات

خیمۂ غیر سے منگوائے ہوئے یہ مخبر
رن پڑے گا تو گھڑی بھر کو نہ دے پائیں گے سات

جب گھر میں رکھی ہوئی ہو میت
پھر جشن بپا کیا ہے کس نے

رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے صحن میں میت
سو وقفے وقفے سے جیسے سسک رہی ہے ہوا

درونِ خیمہ ہی میرا قیام رہنا تھا
تو میرِ فوج نے لشکر میں کیوں لیا تھا مجھے

کوئی مقتل کو گیا تھا مدتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورت تصویر کون

اسیر کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

مقتل وقت میں خاموش گواہی کی طرح
دل بھی کام آیا ہے گمنام سپاہی کی طرح

اردو کی یہ روایت رہی ہے کہ جب زبان وقلم پر مہر لگا دیئے جاتے ہیں تو فنکار علامات و استعارات کے پردے میں بے انصافی کے خلاف جدوجہد اور احتجاج کرنے سے نہیں چوکتا۔ پروین اپنے ایک شعر میں خود اس کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ

الزام تھا دیے پہ نہ تقصیر رات کی
ہم نے تو بس ہوا کے تعلق سے بات کی

(خود کلامی، پروین شاکر، ص:۳۹)

اگر ہم دیکھیں تو ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیضؔ ایک ایسی شخصیت ہے جن کو حکومت نے ہر طرح کی پابندی سے جکڑ رکھا تھا، پھر بھی فیض صاحب کبھی بھی خاموش نہیں رہے۔ وہ کچھ اس انداز میں احتجاج کرتے ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر پہ زباں میں نے

نہ جانے کتنی شمع گل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب کہیں خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

پروین کی شاعری میں زبان کی سادگی و پرکاری، الفاظ وتراکیب اور منفرد انداز کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان ہندی اور فارسی طرز، دھیمے لہجے اور میٹھے بول سے اس کی کیفیت میں ایک الگ اور حساس حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔

سلا رہا تھا نہ بیدار کر رہا تھا مجھے
وہ جیسے خواب میں محسوس کر رہا تھا مجھے

حسن کو سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

پروین کی شاعری میں ہندی انگریزی اور فارسی زبان کے علاوہ عربی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انگریزی طرز کی نظمیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی، انگریزی عنوان کی نظمیں سبھی مجموعہ کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

پروین کی نظموں سے متعلق ڈاکٹر ناظم جعفری لکھتے ہیں۔

> ''پروین شاکر انگریزی ادب کی پوسٹ گریجویٹ تھیں اور انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز انگریزی لکچرر کی حیثیت سے کیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ انگریزی سے زیادہ متاثر تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مجموعوں میں انگریزی طرز کی نظمیں بہ کثرت موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں کے عنوانات انگریزی میں رکھے ہیں۔''

پروین کی شاعری ہر اعتبار سے اہم مانی جا سکتی ہے موضوع کے اعتبار سے ہو چاہے منفرد لب ولہجہ کے اعتبار سے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ہو یا تشبیہات و استعارات کے اعتبار سے۔ ان کی شاعری ہر لحاظ سے اپنے ہم عصر شاعری میں ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

پروین کی زبان اور اسلوب کی لطافت و فصاحت اور انداز بیان کے متعلق اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> ''پروین شاکر کو زبان پر پوری گرفت ہے۔ اردو زبان پر اور اپنی زبان پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور اشارات اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں۔ جو چاہتی ہیں لکھ دیتی ہیں۔ لوگ بھی وہی چاہتے ہیں جو لکھ دیتی ہیں۔''

(پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء، مضمون 'شہزادی... پروین شاکر' از: ممتاز مفتی)

زبان پر پوری گرفت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پروین نے انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کا بھی بڑی ہی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔اس سلسلے میں پروین خود کہتی ہیں:

> "میرے ڈکشن میں کوئی روایتی رکھ رکھاو ہے تو وہ میرے اپنے مزاج اور مطالعے کی وجہ سے ہے۔ جب تک فن کار اپنے فن کے کلاسکی ورثے سے واقف نہ ہوگا اس وقت تک وہ اپنے فن میں تازگی یا ندرت پیدا نہیں کر سکے گا۔"

(سہ ماہی 'اسباق'، مضمون 'خوشبو کا سفر ختم ہوا'، از: خلیل تنویر، ص:۵۲)

O

پروین شاکر آخری عہد میں

پروین شاکر اپنے عہد کی شاعرات میں ایک ایسی شاعرہ تھیں جو صرف عمل کی پیروکار اور کاوشوں پر یقین رکھتی تھیں۔ انہوں نے صدیوں سے چلی آ رہی قدیم روایات اور خارجی دنیا کے بنے بنائے معیارات کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ جو حقیقت میں انہیں پسند آیا، معاشرے کے لیے مفید سمجھا اسے ہی اپنایا اور اپنے انداز فکر کو تاحیات قائم و دائم رکھتے ہوئے اسی پر گامزن رہیں۔ اس احساس کو وہ خود بیان کرتی ہیں، کہتی ہیں:

> ”تلخی و تمنا دونوں شاعری کے محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں، میں ہمیشہ پُرامید رہی ہوں اور تمنا کو میری شاعری میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔“
>
> (معاصر، لاہور ۱۹۹۶ء، ص: ۵۸)

مدت کے بعد چاند نے دستک بدن پہ دی
پھر حجلۂ حیات میں آئی ہے خاص شب

کب شکوۂ تغافل و بیداد سب سے ہے
تجھ سے گلہ ہے اور نہایت ادب سے ہے

پروین کی شاعری کے ذریعے عوام نہ صرف ان کے فکر و فن، جذبات و محسوسات اور تجربات سے واقف ہوتے ہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے اندر پرورش پا رہی صداقتیں بھی کھل کر نمایاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے مسلکِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کو شاعری کا خوبصورت پیرہن دے کر لہولہان اور انسانیت کی گرتی ہوئی دیوار کی خدمت کی، خصوصاً عورتوں کے احساسات، توانا جذبات، دکھ درد، رنج و خوشی کو انتہائی موثر علامتوں میں بیان کیا ہے جو

بہت ہی پُر اثر ثابت ہوئیں۔ عام شعراء کی طرح صنف نازک کی اداؤں اور نزاکتوں کے تصور کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اس سچائی کو بیان کرتی ہیں، جس سے عورت کا استحصال ہوتا ہے۔ پروین نے اپنے ذاتی مشاہدات میں ان اقدار کو للکارا جو صدیوں سے عورتوں کو عام انسانی سطح سے کمتر اور کمزور سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عورتوں کے وجود، معیار اور مقام کی جنگ لڑی، وہ کہتی ہیں کہ عورتیں نزاکت و لطافت کے ساتھ ساتھ دیگر تمام معاملات میں کافی مضبوط وجود اور گہرے شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ پروین کا یہ نظریہ اور بلند حوصلہ آگے چل کر معاشرے میں عورتوں کو ایک مستقل مقام عطا کرنے میں مدد کرتا ہے۔

پروین نے اپنی پوری شاعری میں انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے جن موضوعات و مسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہیئتی تشکیل میں پیش کیا ہے وہ نرم لہجہ اور اخلاقی رویہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں نا آسودگی، ناانصافی اور ناکافی جیسے حالات کا پتہ دیتی ہے۔

پروین نے اپنے کلام میں ایک نئی طرح کی طرز اور مختلف رجحانات و خیالات کو بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان سے پہلے اس طرح کی دوسری نہیں ملتیں۔ پروین نے انفرادیت کے لیے نئی نئی تشبیہات و استعارات کو استعمال کر کے شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ جنگل، شجر، پھول، خوشبو، موسم، بارش، ہوا، صبح، شام، چاند، جگنو، چمن، بن، باغ، تتلی، برف، شبنم، روشنی، پرندے اور سانپ وغیرہ جیسے ناموں کو علامت کے طور پر استوار کیا۔ یہ علامتیں پروین کی شاعری کو دوسروں سے مختلف کرتے ہوئے ان کی وجودیت کا لوہا منواتی ہیں۔ ان تشبیہات و استعارات میں کچھ ایسے نادر اور فحش بھی ہیں جن کا استعمال کرنے سے شعر کی اہمیت و افادیت میں کمی ہوسکتی ہے مگر پروین نے اس کو بھی ایک نئے اور فطری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح کی تشبیہات و استعارات اور علامتیں پروین کی پوری شاعری میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مجموعہ ''انکار'' (جو ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے) میں بھی اس قسم کی تشبیہات و استعارات استعمال کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار درکار ہیں۔

پیرہن کی اک جھلک سے بن معطر ہوگیا
جیسے موج رنگ میں خوشبو کی کوئی رَو بھی ہے

●

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

●

خود بھی جنگل کو مجھے کاٹنا آجائے گا
پر وہ شہزادہ مری نیند کا در تو کھولے

●

اُس باغ میں اک پھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

●

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ!
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

●

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اُداس کتنا تھا

●

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

●

فراق میں ہی رہے ہم ساری عمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیک جان روشن تھا

قدرت نے پروین کے ذہن کو اس حد تک مسخر کر رکھا ہے کہ انھوں نے خود اپنے ایک مجموعہ کا نام ''انکار'' رکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

پروین کی شاعری عام روش سے ہٹ کر اپنی انفرادیت کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے۔ وہ تخلیقی عمل کے کسی لمحہ اپنی شخصیت کو فراموش نہیں کرتی، جذبات کا خلوص، انکار کی پختگی، اس کو

احساسِ ذات سے بیگانہ نہیں ہونے دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آواز، دل سے نکل کر دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کے کلام میں دلوں کو چھو لینے والی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ اسی زمین میں پروین کی شاعری نشو و نما پاتی ہے اور مستقل اسی پر گامزن رہتے ہوئے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ جو اس کی لطافت تخیلی میں ایسے گل بوٹے اور رنگ کھلا دیتی ہے کہ نگاہ کے ساتھ ساتھ دل بھی اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو جاتے ہیں۔ اس کے افکار میں غیر ارادی تسلسل بیانی، خیالات میں موزونیت، تشبیہات و استعارات کی نئی معنویت ان کی بیشتر شعری اصناف میں ایک مسلسل غزل کے Formate میں پرو دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کی یہ غزل:

سج گئی بزم رنگ و نور ایک نگاہ کے لیے
بام پہ کوئی آگیا زینت ماہ کے لیے

فرش فلک پہ پاؤں رکھ، دیکھ تو کس طرح سے ہیں
تارے بچھے ہوئے تری چشم سیاہ کے لیے

دل میں یقیں صبح کی لو جو ذرا بلند ہو!
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سپاہ کے لیے

میری پھٹی ہوئی ردا دے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رُک گیا ہے ایک اور گواہ کے لیے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِ الٰہ کے لیے

سارے جہاں سے کٹ گئے، کتنے اکیلے رہ گئے
کس نے کہا تھا عمر بھر غم سے نباہ کے لیے

پروین کی تمام کائنات صرف ان کا پہلا مجموعہ ''خوشبو'' ہی نہیں بلکہ وہ اپنے سبھی مجموعوں کے بارے میں خود کہتی ہیں:

''خوشبو کی اشاعت میری پندرہ برس سے پچیس برس کی شاعری ہے اور بعد
میں آنے والے مجموعے ایک مختلف نوعیت کے ہیں۔''

''خوشبو''، ''صد برگ''، ''خود کلامی''، ''انکار'' پروین کی شاعری کا ایک گراف بناتے ہیں جس میں ان کی فکر اور ذہنی ارتقاء دکھائی دیتے ہیں، نئے خیالات و رجحانات کی یہ شاعرہ جب خوشبوؤں کے چمن سے نکل کر اس معاشرہ کی طرف گامزن ہوتی ہے جہاں جھوٹ، فریب، مکاری اور بے وفائی کے ساتھ ساتھ مغربیت کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس ماحول میں پروین نے خود اپنے وجود کو دیکھا پرکھا، اس سے باتیں کیں۔ پھر اس طرح کے معاشرہ میں تبدیلی لانے کے لیے ایک دوسرا مجموعہ ''صد برگ'' لکھا اور اس کی چھاؤں میں جرأت و ہمت سے اس معاشرے کی رکنیت سے ''انکار'' کیا۔ اس وقت پروین کے لہجے میں بہت ہی سختی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری سے کبھی پورے معاشرے کے لیے اجتماعی نقطۂ نظر کا اعلان سنائی دیتا ہے تو کبھی قدیم روایات سے (جس میں عورتوں کا استحصال اور ان کو مجبور کیا جاتا ہے) بغاوت کی بو آتی ہے۔ پروین کی شاعری میں کبھی کبھی خود سپردگی، شکستگی اور گریز دکھائی دیتا ہے۔ کبھی بالکل غمگین اور اداس، گم صم، بے نیاز معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرح کی مایوسی، شکستگی ان کے درج ذیل اشعار میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں:

چھت پڑنے کا وقت آیا تو کوئی نہیں آیا
دیوار گرانے کو رضاکار بہت تھے

ہنستی ہوئی آنکھوں کا نگر کہتے رہے ہم
جس شہر میں نوحے پسِ دیوار بہت تھے

صیّاد تو امکانِ سفر کاٹ رہا ہے
اندر سے بھی کوئی مرے پر کاٹ رہا ہے

پروین نے زندگی سے بے کراں محبت بے باکانہ جذبے کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ اس کے باوجود ناگوار حقیقتوں کا شعور بھی ان کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس شعور کے اظہار کے لیے طنزیہ لب و لہجہ اور ساتھ میں مزاح کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کی بہترین اور

بے مثال طویل نظم ''شہزادی کا المیہ'' ہے۔ اس نظم میں شہزادی کو اپنے ساتھیوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ نظم حقیقت میں اپنی طرز کی واحد نظم ہے۔ اس نظم کے لیے بڑی دلچسپی کی بات اس کے موضوع اور اس کی نسبت ہے جو اپنے آپ میں مختلف ہے۔ یہاں پروین کی لفظیات بالکل بدلی ہوئی ہے۔ اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی سماجی حقیقتیں اور ایوان اقتدار کے آس پاس کے مضحکہ خیز دلچسپ واقعات و حالات پروین کی نظر میں ہیں اور وہ ان کو بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہیں۔ اس نظم کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

محل کے نیچے
ہجوم عشاق منتظر ہے
کہ خواب گہ کا حریر پردہ ذرا ہٹے تو
سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں
اور یہ کہنے کا موقع پائیں
کہ عُلیا حضرت!
ہمیں بھی پہچانیے
کہ ہم نے
خزاں کی رُت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شام بے وارثی اُترنے کی ساعتِ بے لحاظ میں
دودمان عالی جناب کو چادرِ عزا نذر کی تھی

آگے اقتباس میں لکھتی ہیں:

جہاں پناہ!
یہ تو دیکھیے
آپ کے لیے
ترک ہم نے کیا کچھ کیا ہے اب تک
کہیں ترقی کا ایک زینہ

کہیں عنایاتِ خسروی کا کوئی وسیلہ
کہیں کوئی منفعت اثر رشتۂ سیاست
کہیں کوئی سیم رنگ شملہ
کہیں کوئی زرنگار طرّہ
اور ان سے بڑھ کر
وطن کی خوشبو وطن کی گرمی!

ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:

کسی طرح قُربِ تاج و دربار کی فضیلت ہمیں عطا ہو
حضور کی بارگاہِ جود و سخا میں
حاضر جو ہونا چاہیں
تو کوئی درباں ہمیں نہ روکے
تو کوئی حاجب، مقربِ خاص تک نہ ٹوکے
غلام گردش میں موجِ صبا گزرنے کی ہو اجازت!

پروین کی شاعری کو سمجھنے کے لیے نگاہ میں تنگی اور یک طرفہ سوچ کو طاق پر رکھنی ہوگی بعض اس کے وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس نظریہ سے قاری کو ان کا فکری و فنی تناظر بہت وسیع نظر آئے گا ورنہ کہنے کو تو بعض لوگ انہیں ایٹین ایج (کمسن) کی شاعرہ بھی کہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں گہری تخلیقیت، تاثر آفرینی اور پختگی ہے۔ عصری حسّیت اور سیاسی و سماجی ادراک سے بھی ان کی شاعری خالی نہیں ہے۔

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا

پروین اس کمسن لڑکی کی نمائندگی کر رہی ہیں جس کے یہاں عشق و محبت کا سمندر اپنی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ ساون کی راتوں میں برسات کا تصور اور بھینی بھینی مٹی کی خوشبو جسم میں ایک عجیب لذتیت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ عمر کا تقاضا ہے کہ جہاں وصل کی تڑپ، ہجر کی کسک اور لمس کی شدت کا احساس ہوتا ہے اس طرح کے احساسات پروین کی شاعری میں

دیکھے جاسکتے ہیں۔ پروین نفسیات سے اچھی طرح واقف نظر آتی ہیں اس لیے انہوں نے کمسن لڑکیوں کی چاہت اور خواہشات کو بخوبی سمجھا اور اُسے اپنی شاعری کے ذریعے منظر عام پر لانے کی خواہاں بنیں۔

پھول کچھ تیز مہک والے بھی اس بار کھلیں
آ کے برسات مرا زخم جگر تو کھولے

میں چپ رہی تو رات نے بھی ہونٹ سی لیے
میں اس کا پیرہن ہوں تو میرا لباس شب

یہ سچ ہے کہ پروین کے یہاں رومانی لہجہ زیادہ غالب ہیں لیکن انہوں نے ذہنی وسعت سے اپنی شاعری کو نئے مشاہدوں، تجربوں اور خوبصورت فنی وفکری خیالات سے بھر دیا، مالا مال کردیا جس کی وجہ سے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بقول نجم الحسن رضوی:

''بنیادی طور پر اس کی شاعری کا منظر نامہ مدینہ تمنا اور کوفہ عشق کے درمیان اس کے اپنے سفر کے تجربوں سے عبارت ہے۔ وہ اردو شاعری کی سنڈریلا تھی جسے لوگوں نے ہمیشہ شہرت کے جادوئی بال، روح میں محو رقص ہی دیکھا مگر وہ جس دکھ نگری کی باسی تھی وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس کے بلوریں شعر کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا۔ اس کی نظموں میں ہمیں نئے فکری گوشے روشن ہوتے نظر آتے ہیں اور اس کی غزلیں ندرت خیال کا پتہ دینے کے ساتھ ساتھ سادگی و پرکاری کا نمونہ اور الم انگیز موسیقیت سے پُر ہیں۔ رومانی دور گزرنے کے بعد کی شاعری میں ہمیں پروین کے یہاں تنہائی کے اُداس رنگ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں مگر ذاتی المیے نے اس کے فن میں قنوطیت کے بجائے گہری فلسفیانہ بصیرت کو جنم دیا ہے۔''

(پروین شاکر: الگ بوطیقا، از: سلیم اختر)

پروین نے اپنی فوری شہرت کے تعلق کے بارے میں ایک انٹرویو میں خود کہا تھا کہ:

''میرے خیال میں شہرت ذرا پہلے میرے گھر چل کر آگئی تھی اس کو دیر

سے آنا چاہیے تھا...... جلد شہرت ملنے میں نفع و نقصان دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ فائدے کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔''

(پروین شاکر: الگ بوطیقا، از: سلیم اختر)

مجموعہ ''صد برگ'' اور ''انکار'' کے درمیان کا عرصہ پاکستانی تاریخ کا ایسا دور ہے کہ اس میں جو کانٹے دار درخت اور پودے بوئے گئے آج ہم سب کے دامن اس سے الجھ کر تار تار ہیں مگر اس عہد کی دہائی نے پروین کو سوچنے اور اس سے انحراف کرنے کے لیے مجبور کر دیا کیونکہ وہ اثبات سے چل کر ''انکار'' تک آ پہنچی۔ دیکھا جائے تو بحیثیت شاعرہ یہ خود پروین کی تخلیقی شخصیت کی پختگی کا عہد ہے جس طرح مٹی سے بنائے ہوئے اثاثے بھٹی میں تپ کر اپنے وجود سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک تخلیق کار معاشرے کے حالات میں رہ کر اپنے وجود کو پہچانتا ہے اور اپنے اندر پختگی لاتا ہے۔ پروین نے بھی اسے قبول کیا بقول خود ''نامردانہ زیست کرنے'' کے برعکس اپنے عہد، عوام، حالات اور تاریخ سے آگاہ ہوئی۔ اس سلسلے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ بیشتر نظمیں بھی قابل تعریف ہیں۔ بالخصوص ''سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسولؐ سے ایک سوال'' اور ''کراچی ــــ ۸۹ء کی آخری شام''۔

اے دین کے آخری پیمبر
تھا لطف خدا کا خاص تجھ پر
بھیجا تھا تجھے بنا کے رحمت
ساری دنیا کے بے کسوں پر
ہوتی رہی تجھ پہ سنگ باری
ہونٹوں سے رہیں دعائیں جاری
ہر سود کو کر دیا تھا باطل
ہر خون معاف کر دیا تھا
تلواریں نیام میں رکھا دیں
چادر میں اٹھا کے سنگ اسود
خوددار مسافرت کی تفسیر

عقبہ کی وہ باوقار بیعت

گھر چھوڑا کچھ اس طرح سے تو نے

ہجرت کو مثال کر دیا تھا

(مجموعہ 'انکار' نظم 'سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسولؐ سے ایک سوال'، ص: ۱۴۰)

مثال کے لیے پروین کی نظم ''کراچی—۸۹ء کی آخری شام'' بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

عکسِ گُل تر جلا ہوا تھا

خوابوں کا نگر جلا ہوا تھا

یا دستِ دعا نہ اٹھ سکا تھا

یا اس کا اثر جلا ہوا تھا

یا نوچ لیے گئے تھے پتے

یا سارا شجر جلا ہوا تھا

تہہ خانۂ جاں میں تجھ کو رکھتی

لیکن مرا گھر جلا ہوا تھا

پرواز کا اتنا ڈر قفس میں

ٹوٹا ہوا پر جلا ہوا تھا

منزل تھی غبارِ راہ میں گُم

اور رختِ سفر جلا ہوا تھا

(نظم 'کراچی—۸۹ کی آخری شام' مجموعہ 'انکار' ص: ۱۴۵-۱۴۶)

مجموعہ ''خوشبو'' اور ''خودکلامی'' کی پروین ذات اور اس کی حسیات کے حصار سے جب باہر نکلی تو اس نے ''صد برگ'' اور ''انکار'' کی شاعرہ کے روپ میں جنم لیتی ہے۔ مجموعہ ''صد برگ'' میں وہ نسائی انفرادیت کی پیدا کردہ خود پرستی اور اس سے وابستہ درون بینی سے دور ہوتی نظر آتی ہے۔ بحیثیت شاعرہ پروین کا اجتماعی شعور جوش میں آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اب اسے اس امر کا اندازہ ہو چکا تھا کہ خوشبو بھی زخمی ہو سکتی ہے (خوشبو پروین کا اصطلاحی نام ہے) اور خوشبو کے برعکس اشیاء کی بھی اس دنیا میں کمی نہیں۔

۱۹۸۰ء میں قلم بند کیے گئے ''صد برگ'' کے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۹۰ء مطبوعہ ''انکار'' کی پہلی غزل کے یہ اشعار ملا کر پڑھیں تو پروین کے فکری منظر نامہ، سماجی شعور اور سیاسی ادراک کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ غزل پروین کی ایک کامیاب غزل کی حیثیت رکھتی ہے:

سج گئی بزم رنگ و نور ایک نگاہ کے لیے
بام پہ کوئی آگیا زینت ماہ کے لیے

دل میں یقیں صبح کی لو جو ذرا بلند ہو!
کافی ہے ایک ہی دیا شب کی سیاہ کے لیے

ہم میں وہ لوگ بھی ہیں جو اے مرے شہر یارِ حسن
آئے نہیں تری طرف منصب و جاہ کے لیے

میری پھٹی ہوئی ردا دے بھی گئی بیاں مگر
فیصلہ رُک گیا ہے ایک اور گواہ کے لیے

کیا ہوا گر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرّہِ زرفشاں تو ہے تیری کُلاہ کے لیے

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِّ الٰہ کے لیے

غزل کے بارے میں پروین کا خیال ہے کہ:

''غزل تو امکانات کے معاملے میں اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ اس کے بارے میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں۔ غزل نے ہر صدمہ سہا اس کے باوجود جانبر ہو کے رہی۔''

پروین اور اس سے فکرور جحانات کے بارے میں ڈاکٹر خالد علوی رقمطراز ہیں:

''پروین شاکر پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی جسمانی

گنجائشوں، فرمائشوں، نابالغ مگر پریشان کن جذبوں اور دکھوں کا بیباک اظہار کیا ہے۔ ان کی شاعری میں 'لڑکی پن' ضرورت سے کچھ زیادہ ہی عیاں ہے۔ غزل کو عورتوں کی باتیں کرنا کہا جاتا ہے لیکن پروین کی غزل میں لڑکیوں کی باتیں ہیں۔"

(معاصر اردو غزل مسائل و میلان، مرتبہ: قمر رئیس، ص: ۱۴۴)

زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

پروین شاکر کے شعری سرمایے میں ان کی عشقیہ شاعری اور رجحانات کو دیکھیں تو زیادہ تر عشق و محبت کی لذتیت ایک مختلف رنگ و آہنگ اور خوشبو سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں باغ، گلستان اور چمن کے استعارے ایک نیا رنگ اور معنویت لیے ہوئے ہیں۔ یہ معنویت پروین کی خودی زندگی اور گھر کی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب کی چاہت سے وابستہ ہے۔ بہت ہی کم ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ پروین ان استعاروں کو تشبیہ کے طور پر کہیں استعمال میں لائی ہوں۔ اگر کہیں گلستاں کا لفظ شعری کلام میں لایا جاتا ہے تو اس کی معنویت عشق و محبت کے جذبات کو اور نکھار دیتا ہے۔

صبا چلی ہے جس انداز گلستاں میں
کسی کو لالہ، کسی کو گلاب ہونا تھا

کیا ہوا آئی کہ اتنے پھول دل میں کھل گئے
پچھلے موسم میں یہ شاخ یاسمیں ایسی نہ تھی

کوئی بتائے کہ جشن بہار کیسے منائے
اک ایسی بیل جو صحنِ چمن کے باہر ہو

تازہ محبتوں کا نشہ جسم و جاں میں ہے
پھر موسم بہار مرے گلستاں میں ہے

ہیں سرخ قبا اتنے کہ مشکل میں صبا ہے
تزئینِ گلستاں کے لیے کس کو چنا جائے

مشرقیت پروین کی شاعری میں پوری طرح حاوی ہے۔ان کی شاعری کا تانا بانا مشرقیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔اس سے ان کے اپنے گھر کی تہذیب، خاندانی طور طریقے اور رسم و رواج کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔آج اس جدید دور میں مغربیت کا حسن اور عریانیت تیز رفتاری سے اپنے جادو بکھیر رہی ہے۔ایک مشکل سوال ہے کہ اس مغربیت کی گرفت میں ایک بڑا طبقہ عریانیت اور جنسی بے راہ روی کا شکار بھی ہوا۔اس کا اثر بڑھتا گیا اور آج ہماری تہذیب دھندلکے میں پڑ گئی ہے۔اس مغربیت کے دور میں خود کی تہذیب میں رہنا پچھڑا پن، کمزور اور بدتہذیب مانا جاتا ہے۔اس کے برعکس مشرقی تہذیب کے ورثے میں شرم و حیا، عزت و عصمت، عفت و پاکیزگی، ایثار و قربانی، بھائی چارگی اور وفاداری ہے۔ پروین نے اسے بڑے ہی شدت سے محسوس کیا اور دل سے قبول بھی کیا اور انہیں اپنی شاعری میں جا بجا پیش کیا۔ان کے یہاں حقیقت اور رومانیت کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔پروین کے لب و لہجہ کا خلوص، جذبات کی صداقت اور سچائی ان کے کلام کو سطحیت سے دور رکھتی ہے۔

اے ماہ و مہرِ حسن، ترے عہد میں کبھی
دن ہی ہمیں خوش آئے نہ آئی ہے راس شب

پروین کے یہاں غزل کے فارمیٹ (Formate) میں ایک نئی چیز داخل ہوتی ہے وہ ہے غزل مسلسل کا تصور۔اس میں غزل کا ہر شعر ایک مسلسل ربط و تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ غزل دیکھیں:

بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

خواب بھی تھے تجھے بھولوں تو روا رکھ مجھ سے
وہ رویہ جو ہوا کا خس و خاشاک سے ہے

بزمِ انجم میں قبا خاک کی پہنی میں نے
اور مری ساری فضیلت اسی پوشاک سے ہے

اتنی روشن ہے تری صبح کی کہ ہوتا ہے گماں
یہ اجالا تو کسی دیدۂ نمناک سے ہے

ہاتھ تو کاٹ دیے کوزہ گروں کے ہم نے
معجزے کی وہی امید مگر چاک سے ہے

غزل مسلسل کے تصور تو ایک نیا رنگ پیدا کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ اس میں ایسی روانی ہے کہ قاری کو پڑھنے میں دلچسپی کا ایک الگ لطف ملتا ہے۔ پروین نے آزاد اور نثری نظمیں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ لکھی ہیں۔ مجموعہ ''انکار'' میں ہی پچیس ایسی نثری نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں جو اپنی ایک الگ نوعیت لیے ہوئے ہیں۔ پروین نے اس طرح کی نظمیں دوسرے مجموعوں میں بھی لکھی ہیں جو بہت کامیاب ہیں۔ نثری نظموں میں پروین نے بڑے ہی اچھے اور کامیاب موضوع اٹھائے ہیں۔ ان کی کامیاب نظمیں جیسے ان کی پہلی نثری نظم ''ندامت''، ''بشیرے کی گھروالی''، ''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور''، ''ایک مشکل سوال''، ''دوست ملک کے لیے ایک نظم''، ''ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ''، ''کراچی''، ''مجھے جان لینا چاہیے تھا'' اور اس کے علاوہ کچھ نظمیں مخصوص لوگوں کے نام یا تعریف میں لکھی گئیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن اپنے مضمون ''کچھ اور نثری نظم کی حمایت میں'' میں اپنے نظریات کو پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''نثری شاعری نثر کے لہجے میں اور نثر کے چوکھٹے میں شعریت کا جادو جگاتی ہے اور جہاں تک ممکن ہے اس میں تشبیہ اور استعارے سے کام نہیں لیتے صرف احساس کے انوکھے پن سے اور مشاہدے کے بظاہر سیدھے سادے رمز سے بلیغ اشاروں تک پہنچنے سے مدد لیتی ہے، اس لیے وہ نثری

نظمیں نہ نثر نہ نظم جو اس شعری بلکہ ڈرامائی بلاغت کو بیدار نہیں کرتیں۔"

(کچھ اور نثری نظم کی حمایت میں، ڈاکٹر محمد حسن)

اگر ہم اس جدید دور کا مطالعہ کریں تو ہمیں مختلف بحروں اور نئے طرز کی نظمیں مل جاتی ہیں۔ اس عہد میں نظم معریٰ، آزاد نظمیں اور نثری نظمیں اپنی مقبولیت لیے ہوئے ہیں۔ جدید شعراء کے یہاں ۱۹۶۰ء تا حاضر تقریباً پچاس برسوں میں ہیئت کے زیادہ سے زیادہ تجربے ہوتے رہے ہیں۔ ان تجربوں میں خاص طور پر آزاد اور نثری نظموں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ پاتے ہیں کہ یہ ہیئتیں سب سے مربوط اور مرغوب ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد نثری نظم کی ہیئت کو ایک قابل قبول مقام حاصل ہوا اور اس کو عام کرنے کا چلن بہت ہی زور شور سے ہوا جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اور اس نے کمال عروج کو پالیا۔ پروین کی شاعری ان کی مرغوب ترین ہیئت آزاد اور نثری نظمیں ہی ہیں۔ پروین کے آخری دور کی شاعری میں اس نوعیت کی نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں کے موضوع بھی مختلف طرح کے ہیں۔ ان نظموں میں پروین نے محبت، سیاست کے علاوہ سماجی، معاشرتی اور استحصال ہوتی ہوئی زندگی کو مدنظر رکھا ہے۔

پروین شاکر نے اپنے خیال اور الفاظ کے انتخاب سے جو ندرت اور جدت پیدا کی ہے وہ بلاشبہ دوسروں کو اپنی طرف مائل اور متاثر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پروین کی گرفت ایک ایک لفظ پر ہے جو ان کے ضمیر میں شامل بھی ہے۔ خیال کا کسی بھی طرح سے دہرانا انہیں پسند نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ نئی تشبیہات و علامات کو اپنانے کی کوششیں کی ان کوشوں سے اردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ پروین ایک انا پرست شاعرہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں انا کا عمل دخل اس قدر تھا کہ ان کی شاعری پر بھی لفظ اَنا غالب ہے۔ انہیں اپنی انا پرستی کا احساس بخوبی تھا۔ انہوں نے ہمیشہ 'اَنا' کا ساتھ دیا۔ کبھی بھی اپنی اَنانیت سے سمجھوتہ نہیں:

گھر ڈوب گیا اور انہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اُس پار بہت تھے

مثالِ ابرو ہوا دل بہم رہیں لیکن
محبتوں میں ذرا فاصلہ ضروری ہے

جب ہم پروین کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی پوری شاعری میں اپنے محبوب سے قربت اور اس کے آنے کی آس و یاس ملتی ہے۔ آخری دور کی شاعری میں پروین شاکر کا جو محبوب ہے وہ ایک نئی علامت کے ساتھ نہایت حسین و جمیل ہے۔ پروین کا محبوب ان کی طرف تھوڑا سا بھی مخاطب ہوتا ہے تو وہ نہایت خوشی اور شادمانی کا احساس کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر ایک چیز بھلی اور خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں محبوب کا عکس شامل ہے جیسے چاند تو خوبصورت ہے مگر محبوب کا دیدار ہونے سے چاند اور خوبصورت دِکھنے لگتا ہے۔ اس کی روشنی سے پروین سراپا روشن محسوس کرتی ہیں۔ ان کے جسم کا ہر اک گوشہ منور ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پروین نے اپنے محبوب کے حسن و جمال کو دوبالا کرنے کے لیے نئی نئی تشبیہات و استعارات اور لفظیات کا استعمال کرتی ہیں:

عکس بے منظر سے دل تسکین سی پانے لگے
دھوپ میں جیسے کوئی آئینہ چمکانے لگے

خانۂ بے چراغ بھی سب کی نظر میں آگیا
تیرے قیام کے طفیل ہم بھی تو باشرف ہوئے

سج گئی بزم رنگ و نور ایک نگاہ کے لیے
بام پہ کوئی آگیا زینتِ ماہ کے لیے

پروین حسن پرست ہوتے ہوئے حقیقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ ان کا دوست خود حسن کا پیکر ہے وہ ہر ایک شئے میں حسن کی تلاشتی ہیں اور خوبصورتی کو شاعری میں ایک مختلف معنویت کے ساتھ کرتی ہیں۔ وہ گلشن سے پھول چننے اور اس کی رنگ و بو میں مصروف رہتی ہیں۔ پروین اپنے محبوب کے حسن اور خوبصورتی کی چاہت میں خود کو فنا کر چکی ہوتی ہیں۔ ادھر محبوب کو خبر تک نہیں ہوتی۔ پروین کبھی کبھی محبوب کی اس بے خبری سے کشمکش میں پڑ جاتی ہیں اور اپنی انانیت کے دامن میں مایوسی کو اس طرح جگہ دیتی ہیں گویا کہ وہ خود محبوب سے دور اور بے خبر ہیں۔

اس کشمکش میں ہم نے ہی کھینچا وفا سے ہاتھ
بارِ جفا سے کوئی سبکدوش ہوگیا

جب پروین ''خوشبو'' سے نکل کر 'انکار' سے کفِ آئینہ تک کی منزل کو طے کرتی ہیں تو ان کے یہاں ایک نیا رنگ اور نئی کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ گرچہ عورت ہی ان کی شاعری میں چھائی ہوئی ہے لیکن بعد میں اس عورت کی شکل اور نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ وہ اب ایک الھڑ دوشیزہ نہیں رہ گئی ہے بلکہ ایک مکمل عورت ہو چکی ہے جو ایک بیوی بھی ہے اور ایک ماں بھی ہے۔ بقول شاہد حسن

> ''پروین شاکر کے یہاں ''خوشبو سے''، ''خود کلامی'' اور ''انکار'' تک پہنچتے پہنچتے عورت اپنی ذات کے سفر میں درپیش انہیں پر پیچ اور پُر خار راہوں سے اپنا دامن تار تار کرتی نظر آتی ہے، جو ان کے بیشتر شاعرات کے تجربات میں، زندگی کی صداقتوں کے طور پر در آئی تھیں۔ پروین کے یہاں عورت کا نسوانی وجود جو ابتداء میں سپردگی اور وفا پرستی کا مظہر بن کر سر جھکا نظر آتا ہے اور ہر لحظہ بکھرنے، ٹوٹنے اور مجروح ہونے کے عمل سے گزرتا تھا۔ ''خود کلامی'' اور ''انکار'' کی شاعری تک آتے آتے ایک ایسے روپ میں بدلتا نظر آتا ہے جو جسم و جاں کی اکائی کو سمیٹے رہنے کے فن سے آگاہ ہو چکا ہے۔ پروین نے محبت کے جذبے کی تہنیت کرتے ہوئے اپنی تمام تر سپردگیوں کے باوجود ایک ایسی عورت کو اپنے اندر تلاش کر لیا ہے جو جھوٹی رفاقتوں کے بہلاوے کے مسلسل اقرار سے اپنے آپ کو کمزور کرنے کے بجائے اب اپنی کھلی آنکھوں سے زندگی کی تمام تر سفاکیوں کو پرکھتی اور جانچتی ہے اور اس پرکھ اور جانچ کو میزان بنا کر رہی ہے۔ حوصلۂ انکار سے بھرپور کام لیتی ہے کیونکہ یہی حوصلہ انکار اس کے تشخص کی بھی بھرپور علامت ہے۔''
>
> (اردو شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار، از: شاہد حسن، ص: ۲۰)

پروین کے یہاں محبت کو کامل تکمیل تک پہنچانا، اس میں کامیابی حاصل کرنا، ایک معراج

کی حیثیت رکھتا ہے۔ محبت کی معراج یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے تئیں ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرے، اس کی ہر ایک ادا کو پسند کرے ایک وقفہ کے لیے جدائی موت کے عالم کا احساس دلائے۔ دل کا تقاضہ یہ ہے کہ محبوب کا خیال ساتھ ساتھ رہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو اس کی تڑپ دل کو ہراساں کرتی رہے۔ ترک تعلقات کے بعد بھی پروین کو محبوب کے دیدار کی خواہش ستاتی رہتی ہے۔ جو دل زخموں سے چور ہو چکا ہو اس کے لیے دنیا کی ہر چیز بے گانی لگتی ہے۔ اسے ہر چیز بے وفا اور بے رحم لگتی ہے۔ پروین کے محبوب کو اپنے معشوق کی کوئی فکر نہیں اور نہ وہ اپنے بارے میں کچھ کہتا ہے اور نہ معشوق کی کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ اس کو کسی کی دوستی، وفا، خلوص اور محبت سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ محبوب کے اس طرح کے رویہ سے پروین ناامید اور بے سہارا ہو جاتی ہیں۔ وہ خود اپنی ایک طرفہ محبت سے انحراف اور نفرت کرنے لگتی ہیں۔ تعلقات کے جس رشتے کو پروین نبھا رہی ہیں اس میں کسی طرح کا کوئی خلوص، ہمدردی اور وفاداری کی نشاندہی نہیں ملتی۔

سارے جہاں سے کٹ گئے، کتنے اکیلے رہ گئے
کس نے کہا تھا عمر بھر غم سے نباہ کے لیے

تری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو مرے سائے سے کترانے لگے

اس کے یوں ترک محبت کا سبب ہوگا کوئی
جی نہیں یہ مانتا وہ بے وفا پہلے سے تھا

پروین ایک عاشقہ ہے۔ اس کے ماتھے پر محبوب کے انتظار اور امید کی کرن نقش ہوتی ہے۔ اس لیے پروین مسلسل انتظار کا سراپا پیکر بن چکی ہے جو ہمیشہ محبوب کے آنے کا خیال دل میں لیے طرح طرح کی خوشیاں مناتی ہے اور محبوب کو مختلف رنگ ڈھنگ میں دیکھتی ہیں۔ پروین نے جس ماحول اور تہذیب میں رہ کر عشق کیا۔ وہاں اس طرح کا کوئی رواج نہیں تھا پر شادی سے پہلے کسی مرد کا خیال دل میں لانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح کا خیال دل میں لانے

سے وہ عورت معاشرہ میں رسوا کردی جاتی تھی اور اس کو تہذیب سے پرے سمجھا جاتا تھا۔ مگر پروین نے ان سب کا خیال نہ کرتے ہوئے اس طرح کے سماج کو نکارا اور روایت سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی محبت کو مسلسل کامیاب کرنے کی کوشش کی۔

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اِس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

پروین روایت سے بغاوت کے سلسلے میں لکھتی ہیں میں نے اورلڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کردیا تھا اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا۔"

روایت سے بغاوت کرنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی چند خواتین جنہوں نے "جرأت مندانہ" قدم اٹھایا۔ ان خواتین میں ایک نام پروین کا بھی لیا جاسکتا ہے جنہوں نے قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے ان روایات سے بغاوت کی جس میں عورتوں کو کمزور اور گھر کی چہار دیواری کے اندر محدود رہنے والی شے سمجھ کر اس کا استحصال کیا گیا اور انھیں معاشرتی نظام کی زندگی میں قید و بند رکھا گیا۔ جن کے دل و دماغ پر ایک مرد کی حکومت کا تاج رکھ دیا گیا تھا۔ پروین اپنے عہد کی ایک مقبول شاعرہ ہیں۔ ان کی زندگی اور روایت سے بغاوت اور مشرقیت کی لاج بچانے کے سلسلے میں کشور ناہید رقمطراز ہیں:

"دوہرائے ہوئے جذبوں کو دہرا کر شاعری نہیں کی ہے۔ اس نے رو کر، التجا کر کے اپنی مشرقیت کی لاج رکھنے کا ہنر بھی نہیں آزمایا ہے۔"

اس کے لیے پروین کو کیا کچھ دشواریاں پیش نہ آئیں۔ انہیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

"میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرم میں شامل ہے مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا (اور اب مجھے دیوار میں چُن دینا ان کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں)...... ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا

اضافہ ہو گیا مگر میخیں ٹھوکنے والے نے، آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا، شاید وہ جانتے تھے کہ انہیں بجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

(پیش لفظ 'رزق ہوا...'، مجموعہ 'صد برگ'، پروین شاکر، ص:۱۳)

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فروختنی
نہ کوئی وعدہ نہ کوئی اصول باقی ہے

پروین نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے محبت جیسے لازوال اور بڑے موضوع کو ایک الگ انفرادیت اور رجحانات کے ساتھ پیش کیا۔ ان سے پہلے زیادہ تر روایتی شاعری میں لب و رخسار، شمع و پروانہ اور گل و بلبل جیسی تشبیہات و استعارات کو پیش کیا جاتا رہا لیکن پروین کے یہاں اس طرح کے تشبیہات و استعارات کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہاں اگر کہیں ملتی بھی ہے تو اس کی علامتیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں کیونکہ انھوں نے صدیوں سے چلی آ رہی روایت سے بغاوت کی ہے۔ انھوں نے غزلوں کی روایتی ہیئت کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنی شاعری میں ایک نئی روح پھونکی اور انہیں تراش خراش کر ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ نئے روایتی پیکر سے مالا مال کیا جس سے شاعری کا حسن بالا ہو گیا۔ پروین کی ان کوششوں سے شعری سرمائے میں نئے اثاثے کا اضافہ ہوا۔ انھوں نے شمع پروانہ، گل و بلبل کی جگہ تتلی اور پھول، خوشبو، جنگل، برسات، اور موسم جیسی تشبیہات و استعارات کا استعمال شعوری طور پر کیا۔ پروین نے غزل کو خالص ہندوستانی رنگ و آہنگ میں پیش کر کے ہندوستان کو مغربیت سے بچایا اور ہندوستان کی قدیم روایات کو بیدار کیا۔ ہندوستانی کا مطلب یہاں پر تقسیم سے قبل کا تصور ہے۔

پروین نے تتلی کا تصور صنف نازک سے لیا ہے۔ ان کی شاعری میں تتلی کا ذکر جہاں جہاں کیا گیا ہے وہاں وہاں ان کی ذات اور ذہنیت سے مراد ہے۔ شاعری کی معراج یہ ہے کہ جس شدت سے فن کار تجربات کو شعر میں ڈھالتا ہے، پڑھنے والا اسی سچائی، خیالات اور رجحانات کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے۔ اس طرح کی فنکاری بغیر خونِ جگر صرف کیے فنکار کے اندر نہیں آتی۔ درج ذیل شعر میں تتلی سے مراد خود پروین اور ان کی معصومیت سے ہے۔

تتلیاں تھے ہم اور قضا کے پاس
سُرخ پھولوں کا جال تھا کیا تھا

پروین کی شاعری بہت ہی دلچسپ ہے۔ ان کی انفرادیت نے شاعری میں نئے رنگ و آہنگ کو اور نکھار دیا۔ بلیغ استعاروں اور بامعنی علامتوں سے سجی سنوری ان کی شاعری قاری کو اپنی طرف مائل کرنے میں تاخیر نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ قاری کو فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ انہیں استعاروں اور علامتوں کے استعمال کرنے اور اس سے اپنے مقصد کو دوسروں تک پہنچانے کا ہنر پروین آتا ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیت اور قوت تخیل سے خوب کام لیا جس کی وجہ سے بہت اچھے اچھے اشعار کہہ ڈالے۔ ان کے بعض اشعار اردو شاعری میں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروین کی محبت سچی تھی۔ وہ اپنے محبوب کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ محبت کی کہانی میں پہلا دخل آنکھوں کی غمازی کا ہوتا ہے۔ جہاں پر یا جس محفل میں ہم کسی بھی طرح کے حرکات وسکنات نہیں کر سکتے وہاں آنکھیں اپنے جلوے بکھیرتی رہتی ہیں۔ زباں خاموش ہوتی ہے پھر بھی نگاہیں بات کرتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں حکیم مومن خاں مومن کا یہ شعر بیساختہ کہنا پڑا:

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

پروین کی محبت اور آنکھوں کا کمال کچھ اسی طرح ہے۔

خبر نہیں کہ تجھے دیکھنے میں آنکھوں کا!
یقیں کتنا رہا، التباس کتنا تھا

آنکھ اُٹھا کر جو روادار نہ تھا دیکھنے کا
وہی دل کرتا ہے اب منت و زاری اس کی

پروین اپنے محبوب سے بے انتہا محبت کرتی تھیں مگر اس کے برعکس ان کا محبوب ان کے لیے اتنا بے قرار نہیں رہتا پھر بھی پروین کے دل میں ہمیشہ اس کے لیے دعائیں اور اچھے

خیالات آتے رہتے ہیں۔ رشتہ رفاقت کے ٹوٹ جانے کے باوجود بھی محبوب کی آنکھوں سے وہ بیتے ہوئے لمحے دکھائی دیتے ہیں۔ پروین صبر کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہجر کی جو شب آئی ہے کسی طرح کٹ بھی جائے گی۔ یہاں پر وہ تخیل سے کام لیتی ہیں۔

کیا شب سے ہمیں سوال کرنا
ہونا ترا صبح دم بہت ہے

کٹ ہی جائے گی شب کی آنکھوں میں
ایک صورت ہے ماہتابی

پروین اپنے محبوب سے مایوس ہیں۔ اس کو بے وفائی نے قید کرلیا ہے مگر وہ کبھی بھی اپنے محبوب کو برا بھلا نہیں کہتیں۔ ہمیشہ تعریف اور اس کی رضامندی کی باتیں کرتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی خوبصورتی کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ پاتیں۔

آج تو اس پہ ٹھہرتی ہی نہ تھی آنکھ ذرا!
اس کے جاتے ہی نظر میں نے اُتاری اس کی

زندگی میری تھی لیکن اب تو
تیرے کہنے میں رہا کرتی ہے

میں تو اڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لیے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیاد کا

پروین اپنی زندگی سے مایوس ہوتی ہیں تو شہر سے گھبرا کر جنگلوں کا سفر کرتی ہیں اور جنگل میں پھولوں کی خوشبو اور اس پر رقص کرتی تتلیاں اور تاریکی میں جگنو کو چمکتا ہوا دیکھتی ہیں۔ انہیں کے ساتھ اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہیں۔ پروین پھولوں کی پنکھڑی میں ہی محبوب کے چہرے کی معصومیت اور رنگ ڈھونڈھ لیتی ہیں۔ اس کی خوشبو میں وہ محبوب کے زلفوں اور سانسوں کی لمس کا احساس کرتی ہیں۔ جگنو کی چمک میں محبوب کے چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی چمک دیکھتی ہیں۔ تتلی کی خوبصورتی، اس کی چمک اور پھولوں پر اس کے لمس کی لذت کو ایک

مختلف نوعیت اور معنویت کے ساتھ دیکھتی ہیں۔ ایسے سبھی احساسات کو وہ اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور بہت حد تک کامیاب ہوتی نظر آتی ہیں۔

تنہا ہوں اس لیے نہیں جنگل سے بھی مفر
اے میرے خوش گماں مجھے اتنا نڈر نہ جان

تتلیاں تھے ہم اور قضا کے پاس
سرخ پھولوں کا جال تھا کیا تھا

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

اس ایک مرہم نوروز و لمس تازہ سے
پرانے زخموں کا بھی اندمال کرنا ہے

اس طرح کے استعارے پروین کی نظموں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں جیسے

اپنے بازوؤں میں لیے
وہ مجھے پھولوں بھری وادی میں
گھومتا رہا

ہم تتلیاں اور جگنو پکڑتے رہے
بارش ایک پیاری دوست کی طرح
ہمارا ہاتھ بٹاتی رہی

('مجھے جان لینا چاہیے تھا' مجموعہ 'انکار' ص:۱۸۶)

بقول خالد حسین:

''جنگل کا استعارہ اس کے یہاں ایک مستقبل صورت اختیار کرگیا ہے۔ جنگل ایک اسیر بھی ہے جس کی نوعیت اجتماعی ہے اور ذاتی بھی۔ یہ جنگل شہر ذات کو بھی مسدود کرتا ہے اور اپنی سرزمین پر بھی محیط ہے۔''

پروین کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود کے تئیں حساس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش کے تئیں بھی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی شاعری سیدھے دل پر اثر کرتی ہے اور ذہن کی آبیاری بھی کرتی ہے۔ ان کا لب و لہجہ زیادہ مانوس نہیں ہے اور نہ ہی پوری طرح اجنبی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرف دل کی دھڑکنیں سُر تال کے ساتھ خوشیاں منا رہی ہیں تو دوسری طرف فکر کے طوفان بھی اپنا کرشمہ دکھا رہے ہیں۔ بہرحال سادگی اور صفائی، بے باکی اور بے ساختگی، تصور و تخیل، لمس اور لذت، رنگ اور خوشبو سے آراستہ شعری تراکیبیں پروین کی شاعری کو نکھارنے میں ایک اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پروین نے جو بھی تشبیہات و استعارات اور لفظیات کو اپنی شاعری میں پیش کیا وہ مختلف نوعیت و معنویت لیے ہوئے ہے۔

پروین نے زندگی کو نہ صرف اپنی نظروں سے دیکھا بلکہ اسے اپنے طور پر محسوس بھی کیا اور اس کو شعری قالب میں ڈھالنے کی پوری کوشش بھی کی۔ شاعری ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ انہوں نے ہر جگہ ہر مقامات پر اپنی قلم آزمائی کی ہے اور اپنے فن کا اظہار انتہائی خوبصورت پیرائے میں کیا۔ پروین کی علمی صلاحیت چوکھی تھی۔ ان کی شاعری کی ایک پہچان زبان کی سادگی و پرکاری بھی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ و تراکیب کا انتخاب ہے اور ان کو صحیح جگہ فٹ کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ الفاظ کو اس طرح سے استعمال کرتی ہیں کہ مقصد واضح ہو جاتا ہے اور شعر کا حسن بھی برقرار رہتا ہے۔ پروین کے یہاں عام فہم زبان اور محاورے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کا عنوان انگریزی میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاعری میں بھی انگریزی لفظوں کو جگہ دی ہے انگریزی عنوان کی نظمیں ہیں ''چیلنج'' "Vanity "The Name is...", "Hot Line", "Good to See you" ''ویسٹ منسٹر ایبے''، ''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور''، "San Francisco" اور "I'll Miss You" وغیرہ۔

پروین کی شاعری میں انگریزی کے علاوہ ہندی، عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے بھی دیکھے جاسکتے ہیں جیسے سمت، دھوپ، دھیان، سہاگ، صندل، چندن، گلال، کاجل، دیا، لالی، جوڑا، ماتھا، بالی، تھالی وغیرہ۔ اس ضمن میں نظم ''وہ باغ میں میرا منتظر تھا'' کا یہ ٹکڑا پیش خدمت ہے جس میں گیت کی سی رنگت کا بھی احساس ہوتا ہے۔

پہنا گہرا بسنتی جوڑا
اور عطرِ سہاگ میں بسایا
آئینے میں خود کو پھر کئی بار
اس کی نظروں سے میں نے دیکھا
صندل سے چمک رہا تھا ماتھا
چندن سے بدن دمک رہا تھا
ہونٹوں پہ بہت شریر لالی
گالوں پہ گلال کھیلتا تھا

(نظم 'وہ باغ میں میرا منتظر تھا' مجموعہ 'انکار' ص: ۱۲۵)

عربی اور فارسی لفظوں کا استعمال اور تراکیب ذیلی اشعار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک سہانی صبح کو شہر جلا ہوا ملا
ہوتی رہیں حفاظتیں ظلِّ الٰہ کے لیے
کُلھُم ایک دیا اور ہوا کی اقلیم
پھیلتی جائے مقدر کی سیاہی کی طرح

فارسی تراکیب اور لفظوں کا استعمال کچھ اس طرح ہے۔

عجب قوت ہے یہ اپنی طرف مجھ کو بلاتے ہیں
لہو میں رقص کرتی جا رہی ہے وحشت پیہم
دریں وحشت بطرزِ آہوئے دیوانہ می رقصم
کہ آب آتش شُد و من صورتِ پروانہ می رقصم

(نظم 'دنیا گرہ فالز' مجموعہ 'انکار' پروین شاکر، ص: ۱۱۵)

پروین ذہنی طور پر انگریزی شاعری سے بے حد متاثر نظر آتی ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کو انگریزی ادب کی اچھی جانکاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعد کی شاعری میں کثرت سے دیکھی جا سکتی ہے۔ پروین کی شناخت غزلوں سے ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں انگریزی لفظوں کی پیوندکاری کی گئی ہے وہ گراں تو گزرتی ہے مگر اس سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔

اس کے استعمال سے اردو شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا۔ غزلوں میں انگریزی الفاظ کا انتخاب پروین کے فن کو مجروح نہیں کرتا بلکہ اس کے حسن کو اور نکھار دیتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کی بھی جانکاری تھی اور اس کے استعمال کا ہنر بھی معلوم تھا۔

میں نے اپنے لان میں احتیاط سے پانی دیتے ہوئے
کنٹونمنٹ بورڈ کو کافی برا بھلا کہا
بھلا یہ بھی کوئی کارکردگی ہے
جس میں پھولوں کو پانی میسر نہ آسکے
میرے سارے امپورٹڈ پودے مرجھائے جاتے ہیں!

(نثری نظم 'ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ' مجموعہ 'انکار'، ص:۱۷۵)

پروین کی نظموں میں انگریزی لفظوں کے استعمال اور انگریزی ادب کے لگاؤ سے متعلق ڈاکٹر ناظم جعفری لکھتے ہیں:

''پروین شاکر انگریزی ادب کی پوسٹ گریجویٹ تھیں اور انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ذہنی طور پر وہ انگریزی سے زیادہ متاثر تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان تمام مجموعوں میں انگریزی طرز کی نظمیں بہ کثرت موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی بیشتر نظموں کے عنوان انگریزی میں رکھے ہیں۔''

پروین نے ''خوشبو'' سے چل کر ''انکار'' کا سفر کرتے ہوئے اپنے آخری مجموعہ ''کفِ آئینہ'' تک شاعری کو نئی انفرادیت کے ساتھ مختلف رجحانات دیے جس سے شعری کائنات کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ ''صد برگ'' کے بعد پروین کے یہاں ایک الگ طرح کے رجحانات پیدا ہوئے۔ ان کے اندر مغربیت کے خلاف آواز اٹھانے، معاشرے سے جنگ کرنے اور اس سے ہونے والی پریشانیوں کو برداشت کرنے کی ہمت میں اضافہ ہوا۔ گرچہ ایسے حالات کے امکان ان کی شاعری میں ملنے لگے تھے۔ اب پروین غمِ ذات سے نکل کر غمِ کائنات سے خود کو جوڑتی ہیں۔ اب ان کے یہاں وہ جدید عورت گھر اور باہر دونوں میں حصہ داری کرنے پر مجبور

ہے اور زندگی کی مصروفیت میں وہ روز جیتی ہے اور مرتی ہے۔ معاشرے کے خونخوار بھیڑیے اپنی نگاہ لگائے کھڑے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں پروین کو تھوڑا سا بھی سہارا ملتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ان وحشیوں سے محفوظ سمجھ بیٹھتی ہے۔ وہ اپنے مکان کی ٹپکتی ہوئی چھت اور گرتی ہوئی دیواروں کو ان وحشیوں کے عالیشان محل سے کہیں بہتر اور اچھا سمجھتی ہیں۔ کہتی ہیں۔

ٹپکتی ہوئی چھت
اور گرتی ہوئی دیواروں نے
کتنے بھیڑیوں کو
مجھ سے دور رکھا تھا!

(نظم: 'ملبے پر لکھی گئی ایک نظم' مجموعہ 'انکار' ص: ۱۸۸)

پروین کی ایک اہم انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بیشتر غزلیں تخلص سے محروم رکھی ہے۔ ان کے کلیات ''ماہِ تمام'' کا پہلا شعری مجموعہ ''خوشبو'' سے آخری شعری مجموعہ ''کفِ آئینہ'' تک کی سبھی نظموں اور غزلوں میں صرف چار جگہوں پر ہمیں ان کا تخلص ''پروین'' ملتا ہے۔ مجموعہ ''خوشبو'' اور مجموعہ ''کفِ آئینہ'' تو پوری طرح تخلص سے محروم ہیں مگر ان کے باقی تین مجموعے ترتیب وار ''صد برگ'' میں ایک جگہ ''خود کلامی'' میں ایک جگہ اور ''انکار'' میں دو جگہوں پر تخلص پروین ملتا ہے۔ تخلص کے وہ چار اشعار ذیل ہیں۔

فصل بروقت نہ کٹتی جو سروں کی پروینؔ
آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

(مجموعہ 'صد برگ' ص: ۲۶۴)

کوئی سیفوؔ ہو کہ میراؔ ہو کہ پروینؔ، اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

(مجموعہ 'خود کلامی' ص: ۷۴)

پروین کے یہاں میراؔ اور سیفوؔ کا ذکر بھی ہوا ہے۔ میراؔ اور سیفوؔ عشق کی علامت اور ایک پاک محبت کا استعارہ ہے۔ میراؔ سے متاثر ہونا ہندوستانی زمین سے جذباتی و نفسیاتی رشتے کی نشاندہی کرتا ہے۔ گرچہ وہ مہاجر نہیں۔ ان کے آبا و اجداد پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔

انہوں نے لفظوں کے انتخاب میں ہندی الفاظ کو پوری فنکاری کے ساتھ اپنے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ جس سے ان کی مشترکہ تہذیب نمایاں ہوتی ہے۔ مجموعہ ''انکار'' کی دو غزلوں میں تخلص دیکھیے

کوئی پوچھے کہ زباں کیا ہے تری تو پروینؔ
وقت ایسا ہے کہ بہتر ہے تقیہ کرلیں

(مجموعہ ''انکار''، ص: ۵۸)

چپ کیوں تجھے لگ گئی ہے پروینؔ
سنتے تھے کہ تجھ میں رَم بہت ہے

(مجموعہ ''انکار''، ص: ۱۳۲)

ویسے تو پروین نے اپنا تخلص ''پروین'' نہ کے برابر استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ مگر دیکھا جائے تو پروین کا اصطلاحی نام ''خوشبو'' ان کی پوری شاعری میں مشکبار ہے اور قاری کو بھی اپنی خوشبو سے معطر کردیتا ہے۔

پروین کی شاعری کا جداگانہ ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں قافیوں کے استعمال میں پوری آزادی سے کام لیا ہے۔ یہاں پر پروین نے شاعری کے روایتی چلن سے بھی بغاوت کی ہے۔ انہوں نے فنی ولسانی ضابطوں کی پابندیوں پر اپنی فکر کو بڑے ہی اچھے اور آزادانہ خیال میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کی انفرادیت سے پروین کو ایک جداگانہ راہ بھی ملتی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل موضوعات واقعات کی منظر کشی بڑے ہی دلکش اور نرالے انداز میں پیش کردیتی ہیں۔

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا

وہ جس کو بزم میں مہمانِ عام بھی نہ کہا
کیسے بتائیں کہ خلوت میں خاص کتنا تھا

بہت لوگ تھے مہمان میرے گھر لیکن
وہ جانتا تھا کہ ہے اہتمام کس کے لیے

مرزا ادیب پروین شاکر کی شاعری، اندازِ بیان اور انفرادیت کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

''پروین شاکر وہ سب کچھ دینے پر قادر رہی ہیں جو کسی کی شاعری کو بھی بڑی شاعری بنا دیتا ہے۔ گہرا تفکر، سنجیدگی، تنوع، ندرت بیان، عصری حسیت، الفاظ کا حسنِ انتخاب، داخلی تفکر کے علاوہ دردمندی بھی۔ اگر کسی طالب علم کو اُردو کی لطیف ترین غزلیہ شاعری کے بھرپور مطالعے کے لیے وقت نہ مل سکے تو میرؔ و غالبؔ کے بعد براہِ راست پروین شاکر تک پہنچ کر اپنے کو کامیاب کر سکتا ہے۔''

('پروین شاکر کی شاعری' از: قیصر تمکین ص:۶۴)

پروین کے سلسلے میں مجتبیٰ حسین رقمطراز ہیں:

''بیشک ہمارے یہاں اچھی شاعرات بھی رہی ہیں اور ہیں لیکن ان میں سے اکثر نے اپنے شعروں میں وہی کہا جو ان کا محبوب سننا چاہتا ہے۔ وہ نہیں کہا جو بحیثیت خاتون وہ کہنا چاہتی ہیں۔ نسوانی جذبات کا ٹھیٹھ اور شائستہ اظہار ہمیں صرف پروین شاکر کی شاعری میں ملتا ہے۔ ایک ازلی جذبہ ہے اس جذبہ کو ابتدائے آفرینش سے فنکاروں نے اپنی تخلیقات پر برتا، پرکھا اور پیش کیا ہے۔ لیکن یہ جذبہ جب پروین شاکر کی شاعری میں نکھرتا ہے تو اس کی چمک دمک سب سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتی ہے۔

(بقول مجتبیٰ حسین)

پروین کے یہاں 'ہوا' کا استعارہ مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'ہوا' ان کی پوری شاعری میں الگ الگ نوعیت کے ساتھ بہتی رہتی ہے۔ کہیں خوشبو لیے ہوئے ہے تو کہیں خزاں کی بے رحمی۔ یہ ہوا صبح میں اپنے لمس سے پھولوں کو زندگی بخشتی ہے تو کہیں شام ڈھلتے حریص ناخن سے انہیں پھولوں کی پنکھڑیوں کو نوچ کر بکھیر دیتی ہیں۔ یہی ہوا کبھی پروین کو اس کے محبوب کے آنے کا پتہ دیتی ہے تو کبھی وہ خود اس ہوا سے اپنے راز کو چھپائے رکھنے کی دعا کرتی ہیں۔ پروین نے اس ہوا سے بہت سا کام لیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کلام میں ہوا میں خوشبو کو ملا کر شاعری کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی معطر کر دیا۔ یہ ہوا سیاسی استعارے کے روپ

میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ یہ ایسے استعارے ہیں جو ملک کے رہنماؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اور رہنما بھی ایسے جو اقتدار کی ہوس اور حکومت کی لالچ میں آنکھیں گڑائے ہیں۔ پروین اس طرح کے رہنماؤں سے دور چاہتی ہیں اور ان کی سیاسی سازشوں سے ملک کے لوگوں کو آگاہ بھی کرتی ہیں۔

تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے

اس نے خوشبو سے کرایا تھا تعارف میرا
اور پھر مجھ کو بکھیرا بھی ہوا ہی کی طرح

ہوا مہک اٹھی، رنگ چمن بدلنے لگا
وہ میرے سامنے جب پیرہن بدلنے لگا

خدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتہ نہ چلے
کہ کچھ چراغ مرے بام و در پہ زندہ ہیں

پروین نے اپنی شاعری میں ایک پرندہ ''طائر'' کا استعمال کیا ہے جو ایک علامتی استعارہ ہے۔ اس پرندے کی یاد نے علامہ اقبال کے محبوب پرندہ ''شاہین'' کی یاد دلا دی۔ شاہین اقبال کا بہت ہی پسندیدہ استعارہ ہے۔ پروین نے بھی ''طائر'' کو اپنا محبوب استعارہ بنا کر پیش کیا ہے۔

ڈھونڈ لے گا پھر اُفق کھوئی ہوئی پرواز کا
دیکھنے میں آج یہ طائر شکستہ پر تو ہے

اُڑ جائے گا پھر اپنی ہواؤں میں تو کیا غم
وہ طائر خوش رنگ تہہ دام تو آیا

گل لے گئے عطار، ثمر کھا گئے طائر
سورج کی کرن باغ میں تاخیر سے آئی

محبت ایک ایسے جذبے کا نام ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی خواہش اور رضامندی کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ پروین اپنے محبوب کی خوشی اور رضامندی کے لیے وہ سب کرنے کے لیے تیار ہیں جس کی معاشرہ اجازت نہیں دیتا۔ ان کے اندر اتنا جنون ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے کو نچھاور کرنے اور خوشی خوشی فنا ہونے کے لیے تیار ہیں۔ مگر پروین کا محبوب بڑا بے وفا اور بے رحم ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں بلکہ وہ پروین کو چھوڑ کر کسی اور کے پیار میں کھو جاتا ہے۔ پھر بھی پروین امید کا دامن نہیں چھوڑتی ہر اک شے میں اس کو محبوب کا عکس نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی وہ تصور میں اس قدر کھو جاتی ہیں جیسے محبوب سامنے کھڑا ہوا ہے اور پروین اس سے گفتگو کر رہی ہوں، مسکرا رہی ہوں، من ہی من خوش ہو رہی ہوں۔ نیند میں خواب اور خواب میں محبوب سے ملاقات ایک ایسی کیفیت طاری کرتا ہے کہ پروین کی چاہت جوش میں آ جاتی ہے۔ مگر پروین جب نیند سے بیدار ہوتی ہیں تو وہی خواب جس میں اس کا محبوب بہت پاس تھا اور پیار کر رہا تھا، اب وہ بہت دور ہو گیا۔ اس کیفیت کو پروین نے کس طرح بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا

پروین کو محبوب کی جدائی کا اتنا ڈر ہے کہ انہیں ہمیشہ اپنے دل میں ایک عجب سی دھڑکن سنائی دیتی ہے یہ دھڑکن موت کی دستک ہوتی سنائی دیتی ہے۔

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

پروین کے اندر محبت کا جو جذبہ ہے وہ ہمیشہ محبوب کے آنے کی امید رکھتا ہے۔

کچھ خبر لائی تو ہے بادِ بہاری اس کی
شاید اس راہ سے گزرے گی سواری اس کی

گھر آپ ہی جگمگا اٹھے گا
دہلیز پہ اک قدم بہت ہے

مجھ میں کبھی آہٹ کی طرح سے کوئی آئے
اک بند گلی کی طرح سے سنسان بہت ہوں

پروین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو مایوس ہو کر کہتی ہیں۔

رستے میں مل گیا تو شریک سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اُسے اپنا گھر نہ جان

پروین کا محبوب بہت بے خبر ہے۔ وہ کسی اور کی چاہت میں گرفتار ہے۔ یہاں پر پروین کا رویہ بدل جاتا ہے اور وہ کچھ اس طرح پیش آتی ہیں۔ ساتھ ہی رقیبانہ لہجہ اور ہرجائی پن بھی ملتا ہے۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

اب پروین ناامید ہو کر کہتی ہیں کہ اچھا ہے میں خود ہی صبر کرلوں اور تمہاری زندگی سے دور ہو جاؤں۔ پھر بھی دل کو سنبھال نہیں سکیں اپنے محبوب کی بھلائی کے لیے دیئے جلائے رہتی ہیں۔

تیری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو مرے سائے سے کترانے لگے

وہ چاہے تو راستہ بدل لے
میں نے تو دیا جلا دیا ہے

پروین محبوب کی بے رُخی اور رقیبانہ رویہ سے آزاد ہونے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

واضح تو ہوا ترکِ محبت کا ارادہ
بارے دِل آشفتہ کو آرام تو آیا

پروین کی شاعری کا ایک انداز طنزیہ بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں طنزیہ اشعار بھی اپنی ایک خاص پہچان لیے ہوئے ہیں۔ ان کے طنز کا انداز بڑا ہی منفرد ہے جس میں محبوب سے

سوال کرنے کا عکس بھی نمایاں ہوتا ہے۔

کون سے پھول تھے کل رات ترے بستر پر
آج خوشبو ترے پہلو سے عجب آئی ہے

پروین ناامید ہو کر خود سے سوال کر بیٹھتی ہیں۔ مگر انا کا دامن نہیں چھوڑتیں۔

چپ کیوں تجھے لگ گئی ہے پروین
سنتے تھے کہ تجھ میں رَم بہت ہے

پروین اپنی شاعری میں جس محبوب کا ذکر کرتی ہیں وہ کوئی اور نہیں ان کا ہم سفر ان کا شریکِ حیات ہے۔ چونکہ پروین کی شادی ہو چکی تھی مگر ازدواجی زندگی میں درار پڑنے کی وجہ سے طلاق ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی پروین کے دل سے اس کی محبت نہیں نکل سکی۔ شادی کے اوائل میں ازدواجی زندگی خوشی خوشی گزر رہی تھی، مگر ان کا ہم سفر کسی موڑ پر انھیں اکیلا چھوڑ گیا۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود پروین کے محبت کو ذیل کے شعر سے سمجھا جا سکتا ہے۔

میں تو اُڑنا بھول جاؤں زندگی بھر کے لیے
بھر گیا ہے دل مگر مجھ سے مرے صیّاد کا

میں تو، تاعمر، ترے شہر میں رُکنا چاہوں
کوئی آکر مرا اسباب سفر تو کھولے

مجموعہ ''انکار'' کی غزلوں میں کہیں کہیں پر خوف کا منظر بھی نظر آتا ہے۔ جس سے قاری کو پروین کے حالات اور دہشت گری کا پتہ چلتا ہے۔ چاہے وہ سماجی زندگی ہو یا عشق محبت کا گلشن، دونوں جگہ خوف کا سایہ ان کے دل و دماغ پر نقش رہتا ہے۔ شہر، بازار اور محفل ہر جگہ بھیڑ بھاڑ اور رونق تو ہے مگر وہاں بھی پروین کا ساتھ خوف نہیں چھوڑتا، برابر ان پر طاری رہتا ہے۔ اگر کوئی خوشی بھی پروین کو حاصل ہوتی ہے تو اس میں بھی خوف شامل ہوتا ہے جس سے ان کو جو خوشی اور آزادی ملنی چاہیے نہیں مل پاتی۔

وہ خوف ہے کہ سرِ شام گھر سے چلتے وقت
گلی کا دور تک جائزہ ضروری ہے

رونق بازار و محفل کم نہیں ہے آج بھی!
سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

دوسری نوعیت کے یہ شعر جس میں معاملات حسن و عشق کے ساتھ خوف بھی ہے مگر اس سے دوسرے طرح کا خوف طاری ہوتا ہے جس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔

تیرے جانے پہ اب کے کچھ نہ کہا
دل میں ڈر تھا، ملال تھا کیا تھا

پروین کی مصیبت اور پاگل پن کا کوئی علاج نہیں کیونکہ ان کا محبوب انھیں فریب دے کر خود کو بہاروں اور رنگ رلیوں میں مگن ہوجاتا ہے مگر پروین اس سے دور غم و یاس کی چہار دیواری کے اندر محدود اس کے ہجر و فراق کے عالم میں وصل کے دیئے جلائے بیٹھی ہیں:

کوئی بتائے کہ جشن بہار کیسے منائے
اک ایسی بیل جو صحن چمن کے باہر ہے

اگر ہم پروین کے ابتدائی دو شعری مجموعوں "خوشبو" اور "خودکلامی" کا مطالعہ کریں تو ہمیں کہیں نہ کہیں کچھ ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جس میں پروین کے طنز و ملامت کا ہدف اس کا اپنا محبوب ہی ہوتا ہے مگر مجموعہ "انکار" میں تلخی اور طنز بہت کم نظر آتے ہیں بلکہ اس کے برعکس آس و یاس، ناامیدی، خودسپردگی اور انتظار کا عالم بے قرار ملتا ہے۔ پروین کا اپنے محبوب کی شخصیت پر ہلکے سے طنز کا عنصر ذیل کے شعر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

اس دل کو جب سے غم کی ضمانت میں دے دیا
اُس وقت سے کسی کے حصارِ دعا میں ہوں

عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر مخلوق میں ہوتا ہے۔ عشق چاہے بھی نوعیت کا ہو۔ جیسے عشق خدا سے ہوتا ہے، والدین سے ہوتا ہے، بھائی بہن سے ہوتا ہے، دوستوں سے ہوتا ہے، یہاں

تک کہ کائنات کی جو بھی شئے پیاری لگے اور آپ کا دل اُن کو قبول کرے تو خود بخود آپ اس سے محبت کرنے لگیں گے اور آپ کو احساس تک نہیں ہوگا کہ یہ سب کب اور کیسے ہوا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ "محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔" یہاں پر ایک انسان کا دوسرے انسان سے عشق و محبت اور دل لگی کا ذکر کیا جارہا ہے۔ عشق کرنے والا یعنی عاشق جو اپنی معشوق کو اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ معشوق کی ہر ادا اس کو عزیز ہوتی ہے خواہ کسی کو کیسی بھی لگے۔ عاشق اپنے معشوق کے لیے چاہتا ہے کہ میرا محبوب دنیا میں اعلیٰ مقام رکھے اور دنیا کے مسائل و مصیبت اسے چھو بھی نہ سکیں۔ عاشق اپنے معشوق کو ہمیشہ خوش اور آرام و آسائش کے لیے دعائیں مانگتا ہے۔ یہی سکون اس کے دل کو بھی خوشی اور سکون پہنچاتا ہے۔ بھلے ہی وہ خود مصیبت میں ہو مگر اپنے محبوب کی خوشی دیکھ اپنی مصیبت کو بھول جاتا ہے اور اس کی خوشی میں شامل کر خوشی مناتا ہے۔

ورنہ یہ تیز دھوپ تو چبھتی ہمیں بھی ہے
ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ تو سائباں میں ہے

کیا ہوا گر نہیں نصیب میرے لباس کو رفو
طرۂ درفشاں تو ہے تیری کلاہ کے لیے

مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ پروین کے عشق میں سچائی، وفاداری، قربانی، خلوص، ہمدردی اور قربت بہت زیادہ ہے اس میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں، بلکہ وہ اپنے محبوب کے لیے ہمیشہ نیک تمنا اور کامیابی کے ساتھ خوش رہنے کی خواہاں ہیں۔

پروین کی شاعری میں تصور حیات نہایت ہی پختہ ہے۔ زندگی جو گزر رہی ہے اس کو اور خوشحال بنانے کے لیے ایک اچھے اور سچے ہم سفر کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ ایسا ہم سفر جو مزاج کو سمجھنے والا آپس کے دکھ درد بانٹنے والا اور خواہشات کو سمجھنے والا ہو۔ ورنہ مزاجوں کا فرق دلوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیتا ہے اور ایک خوشگوار زندگی کو شک کے گھیرے میں لے کر تلخ بنا دیتا ہے۔ پروین کے یہاں کچھ اس طرح کی تلخی اور کشمکش دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں دو دلوں کے مزاجوں میں فرق ہے۔ جس کی وجہ سے پروین کی شاعری میں یاسیت اور مستقبل میں

تاریکی و مایوسی نظر آتی ہے لیکن انھوں نے اپنے محبوب کی طرف سے امید کو کبھی غافل نہیں ہونے دیا ہمیشہ امید کی روشنی میں اپنے من کے دیے کو جلا کر خود کو روشن کیا۔

گھر کا سارا راستہ اس سرخوشی میں کٹ گیا
اس سے اگلے موڑ کوئی ہمسفر ہونے کو ہے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

پروین محبوب کی بے رخی اور بے وفائی سے بھی محبت کرتی ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے وہ اپنے محبوب کے کرب کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ اس کرب کا احساس ان کو اس شدت کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ ایک لمبی جدائی کے بعد چند لمحوں کی ملاقات اس کے لیے ایک نئی اور لمبی زندگی گزارنے کا باعث بن جاتی ہے۔

وہ کیسی، کہاں کی زندگی تھی
جو تیرے بغیر کٹ رہی تھی

پروین کی شاعری میں صبر و قناعت کا عنصر بھی ملتا ہے۔ قناعت کا یہ انداز دیکھیے۔

نظر کے سامنے اک راستہ ضروری ہے
بھٹکتے رہنے کا بھی سلسلہ ضروری ہے

ایک کوزہ، اک عصا، اک خرقۂ گل کے سوا
ہم فقیروں نے کسی نعمت کو گھر رکھا نہیں

پروین کا محبوب ان کو اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو وہ خود کو بے سہارا اور بے بس محسوس کرتی ہیں۔ ان کو ہمیشہ زندگی کے راستے سے گمراہ ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے محبوب کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتی ہیں، کہتی ہیں کہ

فراق میں ہی رہے ہم تو ساری عمر مگر
چراغ سا کوئی نزدیک جان روشن تھا

پروین کی شاعری اور بدلتے ہوئے رجحانات کے بارے میں سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''پروین شاکر ذات وحسن اور پیار کی خوشبو سے چلی مگر ہماری تاریخ کے عہد جبر اور عہد احتساب نے اسے شہر کے مرثیہ پر معمور کردیا اور وہ بھی اس انداز اور اسلوب میں، پیش آثار قدیمہ رک گئے۔ میرے قدم شہر کے دیوار و در کچھ جانے پہچانے لگے۔''

('پروین شاکر ایک الگ بوطیقا' از: سلیم اختر، ص: ۳۷)

پروین کے مجموعوں میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ پابند، آزاد، اور نثری تینوں طرح کی نظمیں شامل ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروین غزلوں کے علاوہ نظموں میں بھی مہارت رکھتی ہیں پھر بھی دیکھا جائے تو پروین بالخصوص غزلوں کی شاعرہ ہیں۔ وہ نظموں میں غزلوں کی مناسبت سے کم کامیاب ہوئی ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ ان کی شناخت صرف غزلوں کی بنا پر ہی ہوئی۔ پروین نے نظموں کے برتنے میں ترقی پسندی اور جدت کی پیروی کی ہے نظموں میں انھوں نے بڑی ہی قابلیت کے ساتھ نفسیاتی رنگ گھولا ہے۔ جس کی وجہ سے نظموں کا رنگ مختلف نظر آتا ہے۔ پروین کی بیشتر نظمیں آزاد اور نثری ہیں۔ آزاد اور نثری نظموں کے سلسلے میں پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ کچھ نظمیں بہت طویل تو کچھ بہت ہی چھوٹی ہیں۔ جس طرح غزلوں میں مختلف موضوع ہیں اسی طرح نظموں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی انفرادیت نظموں میں بھی اپنا کمال دکھانے میں پیچھے نہیں مگر پھر بھی پروین غزلوں کی ہی شہزادی ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پروین نظمیں نہ کہی ہوتیں تو بھی ان کی پہچان وہی ہوتی جو آج ہے۔ ان کی شخصیت پر کسی قسم کی آنچ نہ آتی۔

پروین جیسی بڑی شاعرہ نے نثری نظم پر طبع آزمائی کر کے یہ احساس دلایا ہے کہ وہ نثری نظمیں بھی کہہ سکتی ہیں لیکن ان کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ نثری نظم پر طبع آزمائی کریں کیونکہ ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ پابند نظم بہتر کہہ سکتی ہیں۔

پروین کی ایک نظم جو ''ایک اُداس نظم'' کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نظم کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک سہانی اور پُر آئند خوشی کے گیت کا بھی لطف کرا رہی ہے۔ شاعرہ اس میں شام کا حسین منظر بیان کرتی ہے اور دل میں اپنے

محبوب کے پیرہن کی خوشبو کا ذائقہ لیتی ہے۔ نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

یہ حسین شام اپنی
ابھی جس میں گھل رہی ہے
ترے پیرہن کی خوشبو
ابھی جس میں کھل رہے ہیں
مرے خواب کے شگوفے
ذرا دیر کا ہے منظر!

(نظم: 'ایک اداس نظم' انکار، ص:۲۱)

پروین ترقی پسند شعراء میں فیض احمد فیضؔ کو پسند کرتی تھیں۔ ویسے تو پاکستان میں شعراء کے کئی گروپ تھے مگر پروین نے فیضؔ کے گروپ کو زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے فیضؔ کی جدائی کے سلسلے میں دو نظمیں ایک 'فیض کے فراق میں' اور دوسری 'فیض صاحب کے لیے ایک اور نظم' کے عنوان سے لکھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروین نے شخصی نظمیں بھی لکھی ہیں:

تہہِ خاک
کیسا چراغ وقت نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا،
کفِ دستِ بادِ صبا سے پھول یہ کیا گرا
چمنِ نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں
ہمہ شہرراہ میں اور نگار کہیں نہیں
پُل سبز پر کوئی نجمِ راہ فروز اب نہیں خیمہ کش
وہ غبار اٹھا ہے کہ سوجھتا نہیں راستہ
مرے ماہتاب کہاں ہے تو

(نظم: 'فیض کے فراق میں'، انکار، ص:۲۳)

دوسری نظم 'فیض صاحب کے لیے ایک اور نظم' کے عنوان سے موسوم ہے جس کو پڑھنے سے اس طرح کا منظر سامنے آتا ہے۔ جیسے کہ کسی اپنے کی موت پر۔ اس ضمن میں نظم کا یہ ٹکڑا پیشِ نذر ہے۔

عجب گھڑی ہے
ابھی تجھے سبز خانۂ خاک میں رکھے
اک پہر ہوا ہے
ابھی قبائے سخن سے
تیرے بدن کی گرمی گئی نہیں ہے
فرودگاہِ حیات میں رخصتِ سفر کی
تمام تر گرد دم بخود ہے
نشست کی جا نہیں ملی ہے
تری لحد کے گلاب ویسے ہی تازہ رو ہیں
صبا ابھی تیری مسکراہٹ سے مشک بو ہے!

جہاں تک گروپ اور پاکستانی شعراء میں آپسی تشدد کا سوال ہے تو یہ ایک سیاسی رنگ ہے جس سے شعر و ادب میں نظریاتی اعتبار سے ادبی حلقوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں پروین کا اظہارِ خیال کچھ اس طرح ہے:

> ''ایک تو قاسمی صاحب (احمد ندیم قاسمی) کا گروپ ہے اور دوسرا ڈاکٹر وزیر آغا کا گروپ ہے اور ایک فیض صاحب کا گروپ ہے۔ جو دونوں میں اولیت کرتا ہے کیونکہ میں نہیں جانتی کہ جو صاحب قاسمی صاحب کے گروپ میں ہو وہ یہ کہے کہ میں کسی طور پر فیض صاحب کو مانتا ہی نہیں، یہ احمقانہ سی بات ہے۔ یہ میجر گروپ ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے پاکٹس ہیں جو اِدھر اُدھر چلتے رہتے ہیں۔''

(خوشبو کی شاعرہ، پروین شاکر، ص: ۴۸)

پروین نے چھوٹی نظمیں بھی لکھی ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ نظم ''اے رنج بھری شام'' ایک چھوٹی نظم ہے۔ اس نظم میں پروین نے شام ہونے و محبوب کے آنے کی آہٹ اور دل کو تسلی دینے کا سا منظر پیش کیا ہے۔ اس چھوٹی سی نظم میں انہوں نے کتنی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

دہلیزِ سماعت پہ کسی وعدے کی آہٹ

اُترے کہ نہ اُترے

اے رنج بھری شام!

دکھتے ہوئے دل پر

کوئی آہستہ سے آکر

اِک حرفِ تسلی تو رکھے پھول کے مانند!

''ایک دفنائی ہوئی آواز'' پروین کی اہم نظموں میں ایک مختلف رجحانات کی ہے۔ اس میں شاعرہ کہتی ہے کہ انسان فطری طور پر صرف جسمانی خواہشات کا طلب گار نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل دنیا کی دوسری نعمتوں کا بھی طلب گار ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کس کو اولیت دے۔ زندگی محض مادّی خوش حالی ہی کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو پیار، محبت، ہمدردی، وفا اور ایک اچھے دوست اور اچھے رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے جس کو پاکر انسان سکون محسوس کرتا ہے۔ اگر انسانی رشتے محض جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے تک ہی محدود رہے تو وہ زندگی کا پورا لطف نہیں لے پائے گا۔ اس طرح کے رشتوں سے دلوں میں محبت نہیں ہوتی بلکہ درمیان میں فاصلے بنے رہتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان فطری طور پر آزاد ہے اور وہ ہمیشہ آزاد ہی رہنا چاہتا ہے۔ آزادی ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے۔ اگر اس کی آزادی چھین لی جائے یا اس پر کسی طرح کی پابندی لگادی جائے تو وہ گھٹن محسوس کرتا ہے اس گھٹن سے اس کی رفتار میں کمی آجاتی ہے۔ کچھ اسی طرح کے خیالات و رجحانات اس نظم میں پروئے گئے ہیں۔

پھولوں اور کتابوں سے آراستہ گھر ہے

تن کی ہر آسائش دینے والا ساتھی

آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا بچہ

لیکن اس آسائش، اس ٹھنڈک کے رنگ محل میں

جہاں کہیں جاتی ہوں

بنیادوں میں بے حد گہری چُنی ہوئی

اک آواز برابر گریہ کرتی ہے

مجھے نکالو!

مجھے نکالو!

پروین کا ایک بیٹا جس کا نام 'مراد علی' ہے۔ وہ اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''وہ اپنے بیٹے 'مراد علی' کے لیے جیتی ہے۔ سچ کہتی ہے لیکن کبھی کبھی دیکھ کر شک بھی ہوتا ہے کہ ان میں خود کے لیے جینے کی شکتی بھی موجود ہے۔'' پروین 'مراد علی' کو زندگی کا سہارا مانتی ہیں۔ پروین کے چاروں طرف بھیڑیے اپنی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور موقع کی تلاش میں ہیں۔ ان حالات میں پروین نے اپنے بیٹے 'مراد علی' کو الاؤ کی نوعیت سے پیش کیا ہے جس کے جلنے سے یہ خطرناک بھیڑیے اس آگ کو پار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور ان کی حفاظت ہوتی رہے گی۔

پر مرے گرد

ایسا الاؤ ہے روشن

کہ ہر حیلہ و مکر کے باوجود

یہ درندے

فاصلے کو نبھانے پہ مجبور ہیں

بھیڑیے آگ میں پاؤں رکھتے نہیں!

جب بیٹا تھوڑا اور بڑا ہو کر گھر میں دوڑتا پھرتا ہے تو اس کی چنچل شرارتیں گھر کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ نہیں رہنے دیتی۔ پروین بچے کی اس شرارت سے خوش ہوتی ہیں اور اپنے بیٹے کو پیار سے نٹ کھٹ کنہیا کہتیں اور خود سے کہتیں کہ اگر تو نہ ہوتا تو مرا گھر آنگن بالکل سونا سونا ہوتا، میں کس کے ساتھ ہنستی اور خوشیاں مناتی۔ اس طرح کا منظر پروین کی نظم ''شرارت سے بھری آنکھیں'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں انہوں نے کیا خوب منظر کشی کی ہے۔ اپنے بیٹے کی آنکھوں کو ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے اور شرارت کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

ستاروں کی طرح سے جگمگاتی ہیں

شرارت سے بھری آنکھیں!

مرے گھر میں اُجالا بھر گیا

تیری ہنسی کا

یہ ننھے ہاتھ جو گھر کی کوئی شے

اب کسی ترتیب میں رہنے نہیں دیتے

کوئی سامانِ آرائش، نہیں اپنی جگہ پر اب

کوئی کیاری سلامت ہے

نہ کوئی پھول باقی

آگے پروین نے اپنے بچے کی حرکات وسکنات اور اس کی نٹ کھٹ چال سے خوش ہو کر کہتی ہیں کہ

میں تجھ سے کیا کہوں

تو کون ہے میرا

مرے نٹ کھٹ کنہیا!

مجھے تو علم ہے اتنا

کہ یہ بے نظم اور ناصاف گھر

میری توازن گر طبیعت پر

گراں بننے نہیں پاتا

اگر تو میرے آنگن میں نہ ہوتا

تو میرے خانۂ آئینہ ساماں میں

بہ ایں ترتیب و آرائش

اندھیرا ہی رہا کرتا!

''سفر اب جتنا باقی ہے...'' پروین کی کامیاب نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں پروین نے اپنے بیٹے سے اس کے بچپن سے لے کر جوان ہونے تک کی منظر کشی کی ہے۔ ان کا وہ بچہ اب جوان ہو چکا ہے۔ اس کے اندر ماں کی ممتا اور چاہت کی جگہ کوئی اور لینا چاہتا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں اپنے بیٹے کے بچھڑنے اور کسی اور کی آغوش میں آرام کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پوری نظم میں پروین نے اپنے بیٹے 'مراد علی' سے

مکالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں فلیش بیک کی بھی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جو اپنے آپ میں ایک الگ انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ یہ نظم بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس میں ان کے بیٹے کا ایک عہد ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ نظم کا ایک ٹکڑا۔

زیادہ دن نہیں گزرے
کہ میری گود کی گرمی
تجھے آرام دیتی تھی
گلے میں میرے، بانہیں ڈال کر تو اس طرح سوتا
کہ اکثر ساری ساری رات میری
ایک کروٹ میں گزر جاتی!

نظم کا دوسرا ٹکڑا کچھ اس طرح ہے۔

زیادہ دن نہ گزریں گے
مرے ہاتھوں کی یہ دھیمی حرارت
تجھے کافی نہیں ہوگی۔
کوئی خوش لمس دست یاسمیں آ کر
گلابی رنگ حدت
تیرے ہاتھوں میں سمو دے گا
مرا دل تجھ کو کھو دے گا
میں باقی عمر
تیرا راستہ تکتی رہوں گی
میں ماں ہوں
اور مری قسمت جدائی ہے!

"اپنے بیٹے کے لیے ایک نظم" میں پروین نے بیٹے کے بچپن کے اس لمحہ کا ذکر کیا ہے جس لمحے میں ان کا بیٹا پہلی بار قلم اٹھاتا ہے اور ماں سے سوال کرتا ہے کہ 'کیا لکھوں مما؟' اس نظم میں پروین نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے بچے کو نصیحت آمیز باتیں بتاتی ہیں۔ انہیں خود

اس وقت اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ جب پروین کے والد نے انہیں پہلی بار محبت، نیکی اور سچائی کا درس دیا تھا اور وہ والد کی اِس نصیحت کو قبول کرتے ہوئے قائم رہیں۔ مگر پروین کو اس کا کیا نتیجہ ملا اس کا بھی ذکر اس نظم میں ملتا ہے۔ اس نتیجہ کو دیکھتے ہوئے پروین نے اپنے بیٹے کو سدا سچ بولنے، احسان کرنے اور پیار کرنے کا سبق تو دیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ آنکھیں کھلی رکھنے کی بھی نصیحت دی ہے۔ یہاں پروین اور ان کے والد کی نصیحت دینے کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

مگر میں ماں ہوں
اور اک ماں اگر مایوس ہو جائے
تو دنیا ختم ہو جائے
سو میرے خوش گماں بچے!
تو اپنی لوحِ آئندہ پہ
سارے خوبصورت لفظ لکھنا
سدا سچ بولنا
احسان کرنا
پیار بھی کرنا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا!

''جدائی کی پہلی رات'' نظم میں پروین بہت غمگین اور اداس نظر آتی ہیں۔ اپنے لال سے بچھڑنے کے بعد وہ کس قدر اکیلا پن محسوس کر رہی ہیں اس کا کرب دیکھتے ہی بنتا ہے۔ پروین اپنے بیٹے سے ماں، دوست اور ہمجولی کا رشتہ رکھتی ہیں اور اسی میں وہ خوش بھی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین اپنے بیٹے سے کس طرح گھلی ملی ہیں، مکالمہ کرتی ہوئی پروین کی نظم کا یہ بند دیکھیے

ترے ہوتے ہوئے دنیا سے تعلق کی ضرورت ہی نہ تھی
ساری وابستگیاں تجھ سے تھیں
تو مری سوچ بھی، تصویر بھی اور بولی بھی
میں تری ماں بھی، تری دوست بھی، ہمجولی بھی

''نشاطِ غم'' ایک واقعاتی نظم ہے۔اس میں دو کردار مکالمے کرتے نظر آتے ہیں۔ پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ ایک کردار دسمبر کے مہینے میں یورپ کے کسی علاقے میں سمندر کے بیچ بیٹھا ہے پر اس کی نظر جہاں تک جاتی ہے برف ہی برف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بہت مایوس ہے۔ اچانک کوئی آکر اس سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ تم یہاں اکیلی کیوں ہو؟ تمہارے ساتھ وہ گھنے بالوں، چمکتی آنکھوں اور دلنشین باتوں والا لڑکا کہاں ہے؟ جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا اور تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔لڑکی بہت کشمکش میں پڑ جاتی ہے کہ ہمیں بچھڑے ہوئے سولہ سال ہو گئے اور لوگوں کو ابھی تک یاد ہے۔ وہ حیرت میں پڑ جاتی ہے مگر خوش بھی ہوتی ہے۔اس نظم کا آخری بند نہایت دلچسپ ہے جسے نظم روح بھی کہا جا سکتا ہے:

میرا دل دکھ سے کیسا بھر گیا تھا
مگر تہہ میں خوشی کی لہر بھی تھی
پرانے لوگ ابھی بھولے نہیں ہم کو
ہمیں بچھڑے، اگر چہ
آج سولہ سال تو ہونے کو آئے!

پروین کی نظم 'حبس بہت ہے' ایک سیاسی نظم ہے۔اس میں اس دور کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب پروین کے اپنے ملک پاکستان میں مارشل لاء نافذ تھا۔اس دور میں ملک کا کوئی بھی شخص حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اپنا حق مانگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ سیاست داں آنکھیں بند کر کے ملک کے اندرونی انتشار کو اور ہوا دے رہے تھے۔ کوئی کسی کی فکر نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے شریف اور ایماندار لوگ بھی اس انتشار کی آگ کا شکار ہو گئے۔

حبس بہت ہے
اشکوں سے یوں آنچل گیلے کر کے ہم
دل پر کب تک ہوا کریں
باغ کے در پہ قفل پڑا ہے
اور خوشبو کے ہاتھ بندھے ہیں

کسے صدا دیں

لفظ سے معنی بچھڑ چکے ہیں

لوگ پرانے اُجڑ چکے ہیں

نابینا قانون وطن میں جاری ہے

آنکھیں رکھنا

جرم قبیح ہے

قابلِ دست اندازیٔ حاکم اعلیٰ ہے!

حبس بہت ہے!

پروین کی ایک نظم ''چیلنج'' ہے۔ اس میں سیاسی عنصر نمایاں ہیں مگر اس کے نظریات میں فرق ہے۔ اس میں پروین نے وطن سے محبت اور وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے وطن کی مٹی کی خوشبو کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت کا باعث بتایا ہے۔ پروین نے کچھ نظمیں ظلم وتشدد کے احتجاج میں لکھی ہیں جو حکومت پاکستان کو گراں گزری اور پروین کو بیرونِ ملک جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس پابندی کو پروین نے چیلنج کے طور پر لیا اور اس طرح کی نظمیں لکھ ڈالیں۔

فصلِ خزاں کو فصلِ خزاں کہنے کا مطلب

گلشن سے غداری نہیں ہے

اور اگر ایسا ٹھہرا تو

حاکم وقت کے ہرکارے

مجھ پر فردِ جرم لگائیں

خاکِ وطن کو حَکَم بنائیں!

جمالیات سے متعلق پروین کی جو نظمیں اور غزلیں کہیں ہیں ان میں بھی پروین بہت ہی خوبصورت منظر کشی کرتی ہیں۔ پروین ایک فطرت پرست شاعرہ ہیں اس لیے فطرت ان کے نزدیک بہت عزیز ہے۔ بدلتے ہوئے موسموں، آئی ہوئی بہاروں سے پروین بہت متاثر نظر آتی ہیں۔ انہوں نے چمن کی بہار اور اس کے پھولوں کا ذکر بڑے ہی اچھے انداز میں کیا ہے۔ خوشبو ان کا محبوب استعارہ ہے۔ غزلوں میں تو انہوں نے خوشبو اور رنگوں کی لفظیات کو انسانی

نفسیات سے محبت اور کیفیات کو ظاہر کیا ہے۔ لیکن نظموں میں ایسا نہیں ہے۔ بیشتر نظموں میں خوشبو اور رنگوں کی لفظیات کا رشتہ موسم بہار، موسم خزاں، یعنی کہ اپنے حقیقی معنوں میں آجاتا ہے۔ ان موسموں کی منظر نگاری بھی پروین کو خوب آتی ہے۔ انہیں قدرت کے حسن و جمال کو لفظوں میں پرونے کا ڈھنگ اسی فطرت نے ہی دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ چند نظمیں پیش ہیں جن کا عنوان ہے ''بہار اپنی بہار پر ہے''، ''اس نے پھول بھیجے ہیں''، ''ایک منظر''، ''ایک شریر نظم''، ''ایک پیغام'' اور ''نیاگرہ فالز''۔

درخت اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں
کہیں کسی شاخِ سبز کی اوڑھنی پہ ہلکی سنہری سی گوٹ لگ رہی ہے
کہیں کسی زرد رنگ پتّی کا حاشیہ سرخ ہو رہا ہے
کہیں قبائے شجر گلابی سی ہو گئی ہے
کہیں ہرے پیڑ زرد، نارنج چادریں اوڑھنے لگے ہیں

(نظم: 'بہار اپنی بہار پر ہے'، مجموعہ 'انکار'، ص: ۷۶)

''ایک شریر نظم'' کا بند ملاحظہ ہو۔

جشنِ بہار تھا
بارش فرشِ گل پہ مسلسل ناچ رہی تھی
ہوا کی لَے تھی بے حد شوخ
پیڑ خوشی سے جھوم رہے تھے
ساری فضا پتوں کی ہنسی سے گونج رہی تھی!

نظم ''... لیکن بڑی دیر ہو چکی تھی'' اور "Good To See You" پروین کی ایسی نظمیں ہیں جن کو بالترتیب پڑھنے سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک کہانی ہے جو الگ الگ عنوان سے لکھی گئی ہے۔ جب قاری "Good To See You" تک پہنچتا ہے تو منظر نامہ بدلا ہوا تو ہے مگر بے جوڑ نظر آتا ہے۔ یہاں وہی کردار جو پہلی نظم میں محبت اور دوستی کی علامت بن کر آیا تھا، اب اسی کردار کے خیالات و رجحانات میں تبدیلی ہوتی دیکھی جا سکتی ہے۔ پہلی نظم میں شاعرہ کو کسی کے بچھڑنے یا نہ ملنے کا غم کھائے جا رہا تھا وہی دوسری نظم میں قاری کو دو

دوستوں کے ملاقات کا منظر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اس منظرنامے کو "Good To See You" نظم کے آخری ٹکڑے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حلقۂ یاراں سے آخر
پل بھر کو فرصت پا کر
میری طرف وہ آیا بھی
میری جانب دیکھا بھی
پر جو کہا تو اتنا کہا
آپ سے مل کر خوشی ہوئی
میرے صحنِ دل میں اچانک ہونے والی
پت جھڑ سے یکسر لاعلم!

انگریزی عنوان کی نظم "Hot Line" ہے۔ اس کے نظریات اور موضوع "Good To See You" سے زیادہ قریب ہیں۔ اس میں بھی دو دوست ہیں۔ ایک دوست دوسرے سے اپنی آرزوؤں کا ذکر کرتا ہے اور دوسرا کوئی توجہ نہیں دیتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کا ردِعمل بدل جاتا ہے۔ وہی دوست اب اس دوسرے دوست کی آرزوؤں اور خواہشوں کا انتظار کرتا ہے لیکن اب وہ اپنی خواہشات کا دوبارہ اظہار کرنا نہیں چاہتا۔

لیکن سچی بات یہ ہے
لہجوں اور آوازوں کے
ویسے رنگ نہیں ہیں اب
دُھن تو وہی ہے لیکن دل
ہم آہنگ نہیں ہیں اب!

نظم ''وہ باغ میں میرا منتظر تھا'' میں پروین نے اپنے محبوب کی آمد کا ذکر کیا ہے اور وہ خود بڑی شدت سے محبوب کے انتظار میں سجتی سنورتی ہیں، بالوں میں موتی، آنکھوں میں کاجل، کانوں میں بالی، مانگ میں افشاں اور بانہوں میں گجرے کی مالا پہنتی ہیں۔ پروین نے اپنی اسی خوشی کا منظر اس نظم میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے

قاری کو گیت کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے:

بالوں میں پروئے اتنے موتی
تاروں کا گمان ہو رہا تھا
افشاں کی لکیر مانگ میں تھی
کاجل آنکھوں میں ہنس رہا تھا
کانوں میں مچل رہی تھی بالی
بانہوں سے لپٹ رہا تھا گجرا
اور سارے بدن سے پھوٹتا تھا
اس کے لیے گیت جو لکھا تھا!

پروین کی ایک نظم "سندھ کی ایک بیٹی کا اپنے رسولؐ سے ایک سوال" ہے۔ اس نظم کے شروع میں ایک لڑکی رسول اللہ ﷺ کے اوصاف و انصاف بیان کرتی ہے اور پھر سوال کرتی ہے کہ یا رسول اللہ آج انسان ایک انسان کا اور ایک بھائی بھائی کی جان کا دشمن کیوں ہے۔ وہ بے چین ہو اٹھتی ہے۔ وہ عہد رسالت یاد کرتی ہے جس میں دنیا کے تمام لوگ بہت خوش حال تھے، لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ لیکن اس جدید دور میں جگہ جگہ فسادات، خون و قتل غارت گری سر اٹھائے کھڑی ہے۔ لوگ انسانیت کو بھول چکے ہیں۔ جو شہر کبھی اپنی شخصیت میں شبنم تھا۔ گلابوں کی طرح کھلا ہوا تھا اور وہاں کی صبا میں خوشبو تھی، جو سبھی کو اپنی خوشبو سے معطر کیے رہتی تھی آج وہی شہر آگ، خون اور دھوئیں میں مبتلا ہے۔ کہتی ہیں کہ اک وہ امتی تھے اور اک آج کے امتی ہیں۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ حالانکہ دونوں ایک ہی نبی کو ماننے والے ہیں تو پھر ایسا کیوں؟

پھر کیا ہے کہ ہم میں اور اُن میں
ہلکی سی مشابہت نہیں ہے
بھائی بھائی کو کھا رہا ہے
بستی یہ ہماری جس میں اب بھی

خوشبو ترے نام کی بسی ہے
بارود میں کیوں نہا رہی ہے
شعلے اُسے کیوں نگل رہے ہیں
جو شہر کہ اپنی شخصیت میں
شبنم تھا، گلاب تھا، صبا تھا
اب آگ ہے، خون ہے، دھواں ہے
یہ شہر ہے، سانحہ ہے، کیا ہے
کوفہ ہے کہ کربلا ہے، کیا ہے

پروین کے فن اور مختلف خیالات سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کون سے پھول تھے کل رات ترے بستر پر
آج خوشبو ترے پہلو سے عجب آئی ہے

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آجاتا

گھر سے نکلی تو خبر بن جائے گی آپس کی بات
جو بھی قصہ ہے ابھی تک صحن کے اندر تو ہے

تیری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو مرے سائے سے کترانے لگے

تیرے جانے کا خیال آتا ہے گھر سے جس دم
در و دیوار کی حسرت سے تجھے دیکھتے ہیں

خدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتہ نہ چلے
کہ کچھ چراغ مرے بام و در پہ زندہ ہیں

چاند کے پاس کیا کھلا تارہ
بن گیا سارا آسماں رقیب

جو صبح خواب ہوا، شب کو پاس کتنا تھا
بچھڑ کے اس سے مرا دل اداس کتنا تھا

قاتل کو کوئی قتل کے آداب سکھا دے
دستار کے ہوتے ہوئے سر کاٹ رہا ہے

وہ چاہے تو راستہ بدل لے
میں نے تو دیا جلا دیا ہے

کیا بات ہے جس کا غم بہت ہے
کچھ دن سے یہ آنکھ نم بہت ہے

اُلجھیں گے کئی بار ابھی لفظ سے مفہوم
سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

پروین کی نثری نظمیں

نثری نظموں کے سلسلے میں پروفیسر محمد حسن صاحب کے خیالات کا اظہار پیش کیا جا چکا ہے۔ پروین کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ان کی شعری معنویت کا جو تصور اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ کسی بڑے تخیل پرواز کا سا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے ماضی کو ہمیشہ سینے سے لگایا اور اسی کے خواب و خیال میں کھوئی رہتی ہیں۔ اس طرح کے خیالوں میں کھونے والی محبت کی شاعرہ نے اپنی شاعری کا موضوع بھی عشق و محبت کو ہی بنایا۔ اس کے علاوہ پروین کا دوسرا موضوع سیاسی رہا ہے سماجی مسائل کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا مگر سیاسی نقطۂ نظر سے وہ

احتجاج نہیں۔ وہ اس طرح لاسکیں جوان کے دوسرے رجحانات وخیالات میں ملتے ہیں۔ اس کمی کا اقرار انہوں نے خود نظم ''ندامت'' میں واضح کر دیا ہے۔

میری تمام نظموں کا انتساب اب تک صرف میرے اپنے نام رہا
اور میں خود کو محبت کی شاعرہ سمجھ کر
خوش ہوتی رہی
میں نے کوڑے کے ڈھیر پر بلّی کی طرح چلتا ہوا بچہ نہیں دیکھا
میں نے اینٹ کا تکیہ بنا کر سوتا ہوا راج نہیں دیکھا
راج سے میرے ذہن میں
ہمیشہ راج ہنس آئے
اور بچوں سے تازہ گلاب
میں کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی
میرے بچے
میرے راج
ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا!

پروین نے اپنی عمر کے ساتھ اپنے اندر بدلتی ہوئی فکر کو قبول کیا اور اپنے بارے میں خود کہتی ہیں۔

''محبت اس کی شاعری کا مرکز ہے لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے اور مشاہدات کی نوعیت بدلتی ہے تو محبت کا استعارہ سارے معاشرے، ملک بلکہ ساری دنیا کو اپنی معنوی تہوں میں سمیٹ لیتا ہے۔''

(اردو غزل کی ماہِ تمام از: ڈاکٹر روبینہ شبنم، ص: ۲۷)

نثری نظموں میں پروین کو مقبولیت حاصل ہے۔ انہوں نے نظم ''ندامت'' کے بعد اپنی فکر کو سماج اور سماج میں رہنے والے انسانوں کی طرف مائل کیا۔ خاص طور سے انہوں نے عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی زیادتی، لڑکے اور

لڑکیوں میں نابرابری کا رویہ، شادی سے پہلے اور اس کے بعد کی زندگی کے بندھن واستحصال کا پروین نے انکار کیا اور اس کے لیے آواز بلند کی۔

''بشیرے کی گھر والی'' پروین شاکر کی نفسیاتی نظموں میں اہم ہے۔ یہ ایک نثری نظم ہے۔ اس میں ایک لڑکی کا پورا عہد سمایا ہوا ہے۔ اس کی زندگی میں ہونے والے استحصال اور ناانصافی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ نظم بیانیہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس میں مرد کے مقابلے میں عورت کو کمتر سمجھا گیا ہے۔ ایسے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جہاں مرد آزاد اور عوت قید و بند کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ عورت کو ہمیشہ محدود دائروں میں رکھا گیا۔ جب وہ بچی ہے تو والدین کی گرفت میں ہے۔ ان کے حکم کی تعمیل کرتی ہے اور جب جوان ہوتی ہے تو والدین کی وہ فکر نفرت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد از دواجی زندگی میں اپنے شوہر کی غلامی کرتی ہے۔ گویا کہ اس کی پوری زندگی غلامی کرتے ہوئے گزرتی ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ صرف زنجیر بدلتی رہتی ہے۔ اس غلامی کے باوجود وہ اپنے مالک کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ مگر مالک ہمیشہ اس کا استحصال کرتا رہتا ہے۔ پروین اس جبر و ستم اور غلامی کو برداشت نہ کر سکیں۔ ان کے حساس دل میں استحصال کے خلاف بدلے اور انصاف کی آواز گونجتی رہی۔ وہ زندگی بھر عورتوں کی آزادی اور حقوق کے لیے گامزن رہیں۔ اس نظم کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین کو نفسیات پر کس قدر گہری پکڑ ہے۔ اس کے علاوہ پروین کی دوسری نظمیں جیسے ''ٹماٹو کیچپ''، ''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور''، ''ایک مشکل سوال''، ''ایک افسر اعلیٰ کا مشورہ''، ''ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ''، ''اور کلفٹن کے پل پر...'' وغیرہ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ نظم 'بشیرے کی گھر والی' ملاحظہ ہو:

تیرے پھول سے ہاتھوں میں
تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی
ماں کا آنچل پکڑے پکڑے
تجھ کو کتنے کام آجاتے
اُپلے تھاپنا
لکڑی کاٹنا

گائے کی سانی بنانا
پھر بھی مکھن کی ٹکیہ
ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی
تیرے لیے بس رات کی روٹی
رات کا سالن
روکھی سوکھی کھاتے
موٹا چھوٹا پہنتے

لڑکی جب جوان ہوتی ہے تو باپ کی کڑی نظر اور اس کی نفرت کو پروین نے اپنے نفسیاتی رنگ میں کس طرح رنگا ہے۔

تجھ پہ جوانی آئی تو

تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی
تیرے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر
ایسی کڑی نظر رکھی
جیسے ذرا سی چوک ہوئی
اور تو بھاگ گئی

آگے لکھتی ہیں کہ۔

ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں
پیڑ تلے ستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے
ہے رے!
کن کرموں کا پھل ہے تو

تن بیچے تو کسبی ٹھہرے

من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے

اس نظم میں پروین نے عورتوں کی آزادی اور مساوات کے حقوق کی بات کی ہے۔ معاشرے میں عورتوں پر ہونے والی زیادتی پر چوٹ کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زمانے نے ہمیشہ عورتوں کو مرد سے نیچے درجے کا سمجھا ہے۔ جب کہ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔ دونوں ایک ہی خدا کی بنائی ہوئی مخلوق ہیں۔

''ٹماٹو کیچپ'' اس کا کینوس ادیبوں کی نفسیات وحرکات اور کردار پر منحصر ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک شاعرہ ہے۔ پروین نے اس میں ایک جگہ ''سارا'' نام استعمال کیا ہے جو ممکن ہے کہ یہ نام سارا شگفتہ کا ہو جو اپنے عہد کی مقبول شاعرہ رہی ہیں۔ اس میں شہر کے تمام شعراء اور ادیب شاعرہ کی جھوٹی تعریف کرتے ہیں اور پل بھر کی خوشی چاہتے ہیں۔ شاعرہ کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ وہ سب سے پیار سے باتیں کرتی ہے۔ لوگوں نے اس کی معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا۔ بعض شعراء کی تعریف میں اس کو پاکستان کی ''امرتا پریتم'' تک کہتے ہیں۔ جب کہ ادا جعفری کو پاکستان کی امرتا پریتم کہا گیا ہے۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوتی اور اس کو سچ سمجھ بیٹھتی۔ مگر شاعرہ کی جب آنکھیں کھولیں تو وہ یہ سب طنز برداشت نہ کرسکی اور اس قریب سے نکلنے کی راہ اختیار کی۔

جب تک وہ زندہ رہی

ادب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے

ان کی محفلوں میں اس کا نام

اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے

بس یہ کہ اب وہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے

مرنے کے بعد انہوں نے اسے

ٹماٹو کیچپ کا درجہ دیا ہے!

''اسٹیل ملز کا ایک خصوصی مزدور'' میں پروین نے ملز کے ایک مزدور کی زندگی اور اس

کی محنت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ کہتی ہیں کہ مزدور جو نا سمجھ اور معصوم ہے اسے نہیں معلوم کہ ہمیشہ آگ کے پاس رہنے اور اس کے دھوئیں سے اس کی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کو تو صرف یہ معلوم ہے کہ کم کام کے بدلے زیادہ سے زیادہ مزدوری ملے گی۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ اس کو پتہ نہیں ہے کہ اِسٹیل مِل کی زہریلی گیس اس کے جسم کو کتنا نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس کے بدلے میں ملنے والی مزدوری کچھ بھی نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ اس بھٹی کا ایندھن میں خود ہوں۔ اس نظم میں حقیقت نگاری دیکھنے بنتی ہے۔

لیکن شاید اس کو یہ نہیں معلوم
کہ خودکشی کے اس معاہدے پر
اس نے
بقائمی ہوش وحواس دستخط کیے ہیں
اس بھٹی کا ایندھن دراصل وہ خود ہے!

پروین کی نظم ''ایک مشکل سوال'' جو نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی کامیاب نظم ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں ایک بارہ تیرہ سالہ بچی جو اپنی کم عمری میں ہی زندگی کے مسائل میں الجھ کر بچپن کے وہ خوشگوار دن کھو دیتی ہے۔ اس پر گھریلو کام کاج کا بوجھ اس قدر حاوی ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اس نظم میں شاعرہ جب اس کی معصومیت کا احساس دلاتی ہے تو اچانک اس کے ہاتھوں کا کھردرا پن اور تھکی ہوئی آنکھیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ لڑکی کی کمسنی کے باوجود اس کے ہاتھ اس کے چہرے سے بیس سال بڑے نظر آتے ہیں۔

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے
ایک بارہ تیرہ سالہ چہرہ جھانکا
وہ چہرہ
بہار کے پہلے پھول کی طرح تازہ تھا
اور آنکھیں
پہلی محبت کی طرح شفاف!

لیکن اس کے ہاتھ میں
ترکاری کاٹتے رہنے کی لکیریں تھیں
اور ان لکیروں میں
برتن مانجھنے والی راکھ جمی تھی
اس کے ہاتھ
اس کے چہرے سے بیس سال بڑے تھے!

''دوست ملک کے لیے ایک نظم'' میں پروین نے کہا ہے کہ محبت ''بیان'' نہیں ایک رویہ ہے۔ اس میں انسانیت کو اہمیت دی گئی ہے نہ کہ ملک کو۔ بھلے ہی دو ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہ ہوں مگر واقفیت کی تلافی ان کے خاموش لب اور ان کے ہاتھوں کی حرکات وسکنات سے ہو جاتی ہے۔ آنکھوں کے اشارے ایسے میں بہت کام آتے ہیں۔ جو مکالمے آنکھوں سے بیان ہوتے ہیں شاید انہیں الفاظ میں نہیں کہا جا سکتا۔ پروین نے اس نظم میں انسانیت کو ترجیح دیتے ہوئے دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ دوستانہ رویہ اپنایا ہے۔
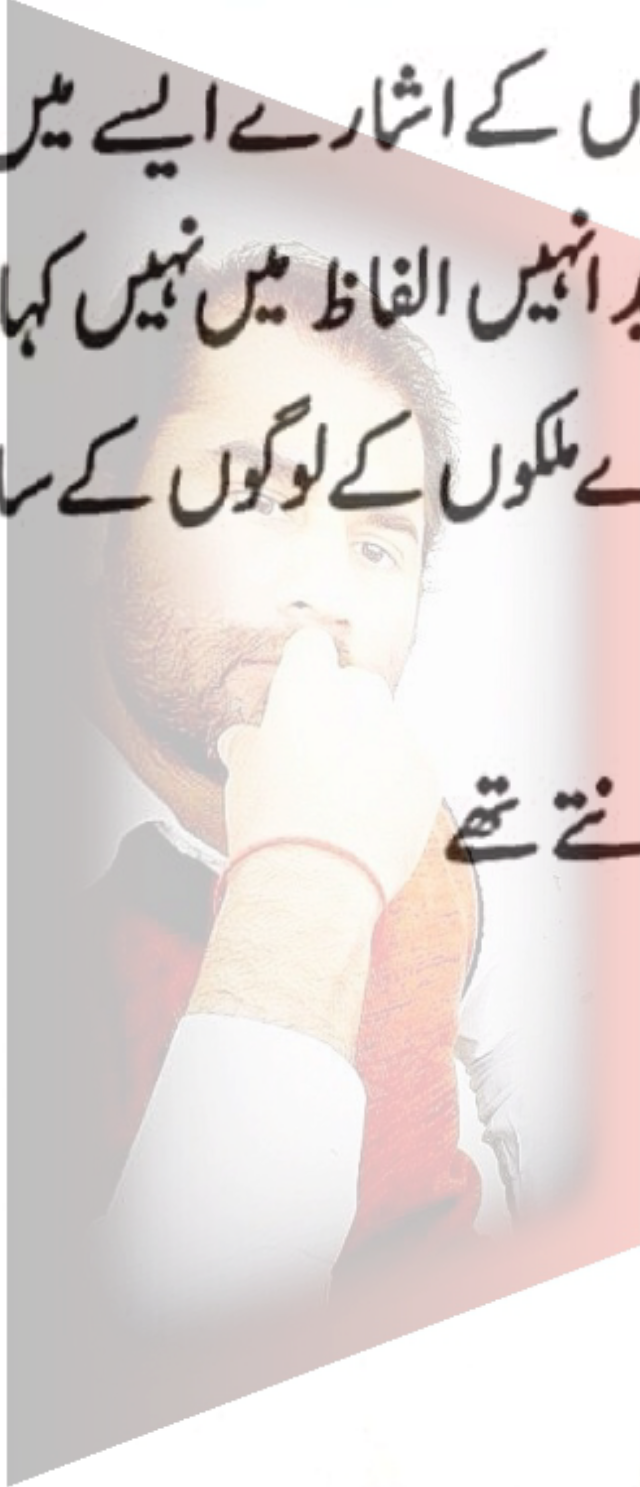
ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے تھے
لیکن ہمارے ہاتھوں کی حرارت
اس ناواقفیت کی تلافی کر رہی تھی
ہمارے ہونٹ خاموش تھے
لیکن ہماری آنکھیں مکالمہ کر رہی تھیں
ہمارے درمیان وہ خاموشی تھی
جو بہت پرانے دوستوں کے بیچ ہوتی ہے!

نظم کے دوسرے بند میں لکھتی ہیں۔

میں وہ بچی کس طرح بھول سکتی ہوں
جس کی آنکھیں مخملیں تھیں اور

اور جس کے چمکدار بالوں میں سرخ ربن بندھا تھا
اور جو محض لباس سے ہمیں پہچان کر
ہم سے لپٹ گئی تھی!

"San Francisco" اس نظم میں پروین نے قدرت کے حسین نظاروں کی منظر کشی کی ہے اور خدا سے دعا کی ہے کہ اے خدا اس شہر کو ہمیشہ آباد رکھنا۔ یہ تیرے بندوں کو تجھ سے قریب لاتا ہے۔ مختلف رنگوں اور مدح طرح کی روشنیوں کی چمک سے ایک حسین اور خوبصورت منظر پیش کیا ہے۔ آگے پروین کہتی ہیں کہ انسان جب فطرت کے نزدیک ہوجاتا ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان فاصلے کم ہوجاتے ہیں:

تتلیاں آپ کے ہمراہ ہوتی ہیں
اور رات کو جگنو بنتے ہوئے آجاتے ہیں
زمیں پر پاؤں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کہیں کسی پھول پر نہ آجائے!

آگے دعائیہ انداز میں لکھتی ہیں۔

اے خدا
اس شہر کو ہمیشہ آباد رکھنا
یہ تیرے بندوں کو
تجھ سے قریب لاتا ہے!

پروین کی بعض نثری نظمیں جو عشقیہ رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں ''کتنے برس لگے...''، ''چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں''، "I'll Miss you" اور ''مجھے جان لینا چاہیے تھا'' ہیں۔ ان میں ''چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں'' اور "I'll Miss you" بہت ہی چھوٹی ہیں۔ یہ نظمیں محبت اور عشق کے جذبات سے بھرپور ہیں۔

''کتنے برس لگے...'' میں پروین نے جس طرح کے خیالات پیش کیے ہیں وہ بہت ہی

منفرد ہیں۔ وہ خود کہتی ہیں کہ تری چاہت میرے اندر سمائی ہوئی ہے مگر مجھ کو اس کا علم بہت دیر میں ہوا اور کہتی ہیں کہ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ شام ہوتے ہی چاند روشن نہیں ہوتا۔ رات ہوتے ہی ''رات کی رانی'' مہک نہیں اٹھتی۔ ان کے درمیان ایک لمحہ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ پروین نے اس میں جو استعارات و تشبیہات استعمال کی ہے وہ اپنی حقیقی نوعیت کے ساتھ معنویت لیے ہوئے ہیں۔

کتنے برس لگے
یہ جاننے میں
کہ میرے اندر تیرا ہونا کیا ہے
ایسا ہونا بھی چاہیے تھا
شام ہوتے ہی
چاند میں روشنی نہیں آجاتی
رات ہوتے ہی
رات کی رانی مہک نہیں اٹھتی
شام اور روشنی کے بیچ
رات اور خوشبو کے بیچ
ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے
جس کا ہماری زمین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا
اس آسمانی لمحے نے
اب ہمیں چھو لیا ہے!

مندرجہ ذیل دو نظمیں جن کو پروین نے ''چاند کی روشنی میں لکھی گئی دو نظمیں'' کے عنوان سے لکھا ہے، کافی چھوٹی مگر عشق و محبت سے لبریز ہیں۔ اس کے علاوہ ہجر و فراق کی کیفیات کا عالم بھی بیان کیا گیا ہے۔ پہلی نظم میں پروین شاکر نے چاند کی شروعاتی راتوں کا ذکر کیا ہے اور کہتی ہیں کہ میرا دل چاند کی چاندنی کے مانند محبت کی روشنی سے روشن ہے۔

(۱)

شروع راتوں کا چاند تھا
پھر بھی
سارا باغ روشنی سے بھرا ہوا تھا
جیسے ہمارے دل
محبت سے!

اسی عنوان کی دوسری نظم جس میں پروین نے چاند کی آخری راتوں کی کیفیات کو کچھ اس !نداز میں بیان کیا ہے:

(۲)

چاند کی آخری تاریخیں تھیں
کنج چمن کی خوشبو بھری تاریکی میں
اُس نے دیے کی لو کو اونچا کیا
اور میری آنکھوں میں جھانکا
پھر ہمیں کسی دیے کی ضرورت نہیں رہی!

اس طرح کی ایک مختصر نظم جس کا عنوان انگریزی میں "I' ll Miss You" ہے۔ اس میں پروین کا محبوب کہیں دور جانے کے لیے ان سے رخصت ہوتا ہے مگر رخصت ہونے سے پہلے وہ انگریزی کا ایک جملہ "I'll Miss You" (میں تمہاری کمی محسوس کروں گا) بولتا ہے۔ اس جملے سے پروین کی محبت جوش میں آجاتی ہے۔ وہ ہمیشہ محبوب کے اس جملے کو یاد کرتی ہیں اور محبوب کی یادوں میں کھوئی رہتی ہیں۔

جانے سے پہلے
اس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا
I' ll Miss You
سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا!

''مشورہ'' پروین کی مختصر نظموں میں سے ایک ہے۔ اس کی انفرادیت بھی مختلف ہے۔ نظم کو پڑھنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مریض کو مصنوعی مشینوں اور اعلات کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مگر پھر صبر کرلیا جاتا ہے کہ اس کو تو مرنا ہی ہے۔ کب تک ہم ان اعلات کی مدد سے اس کو مصیبت میں ڈالے رہیں گے۔ اس لیے جتنے بھی اعلات لگے ہوئے تھے، نکال دیئے گئے اور اس کو آرام کی نیند سونے دیا گیا۔ اس میں پروین نے اسلوبیاتی سطح پر تین لفظوں کے استعمال سے فکر و خیال کو نثری نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ ان لفظوں میں کلنیکل، موت، مصنوعی تنفس اور منافقت کا پلگ جیسی ترکیبوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کا دوسرا اشارہ ایک زوال پذیر معاشرہ اور وہاں کی عوام سے متعلق ہے۔

ہماری محبت کی کلنیکل موت واقع ہو چکی ہے!
معذرتوں اور عذر خواہیوں کا مصنوعی تنفس
اسے کب تک زندہ رکھے گا
بہتر یہی ہے
کہ ہم منافقت کا پلگ نکال دیں
اور ایک خوبصورت جذبے کو باوقار موت مرنے دیں!

''اُسے اس بات کا پتہ نہیں'' نظم میں پروین بارش کے موسم کا ذکر کرتے ہوئے محبوب کے ساتھ جشن منانے کا خیال پیش کرتی ہیں۔ بارش کو اپنی سہیلی بنا کر موسم بہار کا لطف لیتی ہیں۔ ایسا محسوس کرتی ہیں کہ ان کا محبوب پیار کی سرگوشیاں کررہا ہے۔ یہ سوچ کر پروین خوشی سے مسکرائے بنا نہ رہ سکیں۔ حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ وہ بالکل اکیلی ہیں پھر بھی وہ خود سے سوال کر بیٹھتی ہیں اور بارش کی رم جھم سے انہیں جواب کا لطف بھی ملتا رہتا۔ پروین من ہی من میں خوش ہوتی رہتی ہیں۔ وہ تخیل میں ہی ہجر و وصال کے مزے لیتی رہتی ہیں۔

اس نے کہا
ہم جب بھی سفر پہ نکلتے ہیں
بارش ہمارے ساتھ ہو لیتی ہے
ایک تیسرے شخص کی طرح

اس کے لہجے میں چھپی ہلکی سی خفگی پر
میں مسکرائے بنا نہ رہ سکی
مجھے احساس ہے
کہ کبھی کبھی
اس کے کسی سوال کا جواب
میں بارش کو دے دیتی ہوں
مگر اسے اس بات کا پتہ نہیں
کہ جس حبس بھری دنیا میں ہم رہتے ہیں
وہاں
بارش ہی ہماری دوست ہو سکتی ہے

"اُسے اس بات کا پتہ نہیں" کے ہی رجحانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پروین نے نظم "مجھے جان لینا چاہیے تھا" لکھی۔ اس میں بھی ساتھی کی آمد اور موسم بہار کی منظر کشی کی گئی ہے یہاں تخیل پردازی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ نظم کے شروع کے بند میں وصل اور جشن کا لطف ملتا ہے تو اخیر میں ہجر اور مایوسی کا دامن۔ ان کا ساتھی صرف موسم بہار تک کا ساتھی ہوتا ہے۔ خزاں کا موسم آتے ہی ان کا یہ دوست اپنی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اس برتاؤ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عمر ڈھلنے کے بعد کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ اس نظم میں ایک دوست کی خودغرضی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

جس دن درخت سے پہلا پتہ گرا
میں اسے اٹھانے کے لیے جھکی
پلٹ کر دیکھا
تو وہ جا چکا تھا!
اب میں ٹوٹے ہوئے پتوں میں
اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں

مجھے جان لینا چاہیے تھا
کہ اس کا اور میرا ساتھ
موسم بہار تک ہے!

پروین نے ایک نظم اپنے ہمدرد پروین قادر آغا کے نام لکھی ہے جس کا عنوان ''پروین قادر آغا'' کے نام سے ہی موسوم کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین کو آغا سے بہت قربت تھی۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تو اپنا چوتھا مجموعہ ''انکار'' پروین قادر آغا کے نام ہی منسوب کیا ہے۔

آغا سے پروین کی قربت ان کی نظم ''پروین قادر آغا'' کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پروین کو معاشرے نے ذلیل و رسوا کر دیا۔ لوگ بہت تنگ نظری سے دیکھنے لگے۔ گھر سے بھی سہارا ملنے کی امید نہ رہی۔ کیونکہ اہل خانہ کی خاموشی کہہ رہی تھی کہ ''تم ہمارے لیے مر چکی ہو''۔ اس طرح کے رویے سے پروین بہت غمگین اور مایوس رہنے لگیں۔ ان کے چاروں طرف مفاد پرست، بھیڑیے کی طرح موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔ ایسے میں انہیں پروین قادر آغا نے سہارا دیا اور کہا کہ ''ہمیں کسی کی پرواہ نہیں، تم جیسی بھی ہو، ہمیں عزیز ہو'' یہ سن کر پروین خوشی کے ساتھ رو پڑیں اور من ہی من میں کہا کہ ''کبھی کبھی خدا فرشتوں کو بھی زمین پر بھیج دیتا ہے۔'' اس نظم میں پروین پوری طرح بے بس اور بے سہارا محسوس کر رہی ہیں۔ نظم کا بیانیہ انداز کچھ اس طرح ہے:

مجھ میں اور پاگل پن میں
بس ایک رات کا فاصلہ رہ گیا تھا
خودکشی بھی میری تاک میں بیٹھی تھی
قریب تھا کہ
میں اس کے ہاتھ آجاتی
کہ ایک سایہ میری طرف بڑھا
اور میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا

"ہمیں کسی کی پرواہ نہیں
تم جیسی بھی ہو، ہمیں عزیز ہو!"

پروین کے اس شعر سے میں اپنی گفتگو کو ختم کرنا چاہوں گا جس میں پروین کی خوشی اور محبوب کی آس و یاس بندھی ہوتی ہے۔

کچھ خبر لائی تو ہے بادِ بہاری اس کی
شاید اس راہ سے گزرے گی سواری اس کی

○

کتابیات

۱۔ آزادی کے بعد اردو شاعرات: نجمہ رحمانی، بھارت آفسیٹ پریس، دہلی ۱۹۹۴

۲۔ اردو شاعری میں جدید پاکستانی عورت کی حسیت کا اظہار: جویزہ خالدہ، ثمینہ رحمان، اثر پبلی کیشنز، لاہور 1995

۳۔ اردو شاعری پر ایک نظر: کلیم الدین، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۱۹۸۳

۴۔ ادبی رجحانات (پاکستانی زبانوں کے ادب پر مقالات)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۴

۵۔ پاکستانی معاشرہ اور ادب: ڈاکٹر سید حسین، محمد جعفر احمد سلیم، ماس پرنٹنگ پریس، کراچی، اپریل ۱۹۸۷

۶۔ پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں: آزاد کوثر، ری پبلکن بکس ٹمپل روڈ، لاہور ۱۹۸۸

۷۔ پاکستانی ادب (حصہ شعر): جاوید شاہین، انیس ناگی، کرسٹل پرنٹرز، اسلام آباد 1995

۸۔ ہندو و پاک میں اسلامی کلچر: پروفیسر عزیز احمد، ترجمہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۱

۹۔ نظریہ پاکستان اور نصاب کتب: محمد صدیق، خوشنولیس پنجاب، ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور دسمبر ۱۹۷۱

۱۰۔ مغل شہزادیاں: محمود علی، ثوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، دہلی، جنوری ۲۰۰۰

۱۱۔ اردو غزل کی ماہ تمام پروین شاکر: ڈاکٹر روبینہ شبنم، بھارت آفسیٹ، دہلی ۲۰۰۴

۱۲۔ پروین شاکر کی نظمیہ شاعری (تنقید و تجزیہ): ڈاکٹر روبینہ شبنم، بھارت آفسیٹ، دہلی ۲۰۰۵

۱۳۔ چشم دروں۔ مضمون: پروین شاکر رنگ، روشنی اور خوشبو کی شاعرہ: شہپر رسول، جامعہ ملیہ

اسلامیہ، نئی دہلی ۲۰۰۰
۱۴۔ اردو غزل میں پیکر تراشی (آزادی کے بعد): شہپر رسول، دہلی ۱۹۹۹
۱۵۔ نئی شعری روایت: شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۸
۱۶۔ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات: شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۷
۱۷۔ جدید اردو غزل کی علامتیں: ڈاکٹر نجمہ رحمانی، بھارت آفسیٹ پریس، دہلی ۱۹۹۴
۱۸۔ اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک: قاضی مشتاق احمد، مکتبہ جامعہ، جدید دریا گنج، دہلی ۲۰۰۲
۱۹۔ جدید شاعری: ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۳
۲۰۔ لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر: سید عبدالباری ۱۹۸۷
۲۱۔ عصری ادب (پاکستان نمبر)، نئی دہلی ۱۹۷۹
۲۲۔ ساز سخن (مجموعہ کلام): ادا جعفری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۹۸۹
۲۳۔ شام کا پہلا تارا (مجموعہ کلام): زہرہ نگاہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۰
۲۴۔ اپنا جرم ثابت ہے (مجموعہ کلام): فہمیدہ ریاض، سٹی پریس، کراچی ۱۹۸۸
۲۵۔ پتھر کی زبان (مجموعہ کلام): فہمیدہ ریاض، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی ۱۹۸۳
۲۶۔ شب زاد (مجموعہ کلام): شبنم شکیل، مارا پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷
۲۷۔ دھرتی کا لمس (مجموعہ کلام): زاہدہ زیدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۵
۲۸۔ آتش سیال (مجموعہ کلام): ساجدہ زیدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۲
۲۹۔ دائروں میں پھیلی لکیر (انتخاب کلام): کشور ناہید، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۷
۳۰۔ پس آئینہ (مجموعہ کلام): یاسین حمید، مکتبہ ابلاغ، طارق منزل ۱۹۹۰
۳۱۔ پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال: شہزاد منظر، منظر پبلی کیشنز ۱۹۹۶
۳۲۔ خوشبو (مجموعۂ کلام): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۵
۳۳۔ صد برگ (مجموعۂ کلام): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۵
۳۴۔ خود کلامی (مجموعۂ کلام): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۵
۳۵۔ انکار (مجموعۂ کلام): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۵
۳۶۔ کف آئینہ (مجموعۂ کلام): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۶

۳۷۔ ماہِ تمام (کلیات): پروین شاکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۶

۳۸۔ معاصر اردو غزل مسائل میلانات: پروفیسر قمر رئیس مضمون: پاکستان میں غزل کے چند اہم رجحانات: ڈاکٹر خالد علوی، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۴

۳۹۔ اردو میں نسائی ادب، منظر اور پس منظر: پروفیسر قمر رئیس، مجلّہ مشام، مدیر: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن ۲۰۰۴

۴۰۔ پاکستان میں اردو غزل: معین الدین عقیل

۴۱۔ جدید اردو ادب (۱۹۴۷ کے بعد اردو ادب کا تنقیدی جائزہ): ڈاکٹر محمد حسن، غضنفر اکیڈمی، کراچی، پاکستان ۱۹۴۴

۴۲۔ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری: یعقوب یاور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۷

۴۳۔ شہزادی... پروین شاکر، پاکستانی ادب، ممتاز مفتی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۹۴

۴۴۔ کانچ کی گڑیا، پاکستانی ادب، خالد حسین، ڈاکٹر سلیم اختر ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات، پاکستان ۱۹۹۴

۴۵۔ پروین شاکر: آفتاب احمد، اکادمی ادبیات، پاکستان ۱۹۹۴

۴۶۔ خود کلامی کی پروین شاکر: احمد ندیم قاسمی، اکادمی ادبیات، پاکستان ۱۹۹۴

۴۷۔ پروین شاکر: خوشبو کی شاعرہ

۴۸۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ: ڈاکٹر منظر اعظمی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۹۶

۴۹۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۷

۵۰۔ ادب خواتین اور سماج: ڈاکٹر صادق

رسائل

۱۔ پروین شاکر: علی سردار جعفری، کتاب نما، فروری ۱۹۹۵

۲۔ پروین شاکر: خوشبو کی شاعرہ: سیر اردوی، ماہنامہ نیا دور مئی ۱۹۹۰

۳۔ پروین شاکر الگ بوطبقا: سلیم اختر، ماہنامہ 'آئندہ' شمارہ: ۱۱-۱۲ کراچی، مدیر: محمود واجد، نومبر، دسمبر ۱۹۹۶

۴۔ پروین شاکر والہانہ جذبوں کی بے ساختہ اظہار کی شاعرہ: ڈاکٹر اظہار مسرت، نیا دور اکتوبر ۱۹۸۴

۵۔ پروین شاکر ایک تجزیہ (خوشبو کی غزلوں کے حوالے سے): محمود کاظمی، آج کل، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۵

۶۔ پروین شاکر: ڈاکٹر شمیہ رضوی، نیا دور، لکھنو دسمبر ۱۹۹۳

۷۔ پروین شاکر کی شاعری: احمد امتیاز، ماہنامہ زبان وادب جون تا ستمبر ۲۰۰۵

۸۔ خوشبو کا سفر -- پروین شاکر: ڈاکٹر اسلم الہٰ آبادی، نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۹۸

۹۔ پروین شاکر کا شعری سفر: عظیم اقبال، ماہنامہ گنج، 1 بتیا بہار، شیرازہ سری نگر جلد: ۳۴، شمارہ: ۶-۷، مشمولہ: اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر

۱۰۔ نمائندہ اردو شاعرات کے کلام پر ایک نظر: محمود عالم، نیا دور، اکتوبر ۱۹۸۷

۱۱۔ دور حاضر کی نمائندہ پاکستانی شاعرات: ایم جمال علوی، ماہنامہ نیا دور، جنوری ۱۹۹۰

۱۲۔ چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو: حقانی القاسمی، شمارہ: ۲، مئی ۲۰۰۴

۱۳۔ اردو شاعری میں عورت کا تصور: صغرا مہدی، شمارہ: ۶، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۱۴۔ پروین شاکر شخصیت اور فن: شاغل ادیب ایم، اے، ماہنامہ کتاب نما ۱۹۹۹

۱۵۔ پروین شاکر کی شاعری: قیصر تمکین، رسالہ فنون لاہور، جنوری تا اپریل ۱۹۹۶

۱۶۔ سنڈریلا نے کوچ کیا: نجم الحسن رضوی، رسالہ فنون سہ ماہی لاہور، جنوری تا اپریل ۱۹۹۵

۱۷۔ پروین شاکر کی استقامت: احمد ندیم قاسمی، رسالہ 'فنون' سہ ماہی، لاہور جنوری تا اپریل ۱۹۹۶

۱۸۔ پروین شاکر کی یاد میں: مجتبیٰ حسین، رسالہ 'ہماری زبان' ہفت روزہ بمقام: دہلی، یکم فروری ۹۵

Parveen Shakir ki Shaiery

Ek Tanqeedi Jaaeza

by

Dr. Mohd Tanveer

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-380-6

₹ 200.00